اردو
لائبریری
اردو ناول، ادبی افسانے
مضامینِ پطرس
مع حالاتِ زندگی اور فرہنگ کے ساتھ پہلی بار
پطرس بخاری

مضامینِ پطرس

مصنف

سیّد احمد شاہ پطرس بخاری

گوھر پبلیکیشنز

سید پلازہ فسٹ فلور A-3، چیٹر جی روڈ، اردو بازار لاہور

فون: 042-37027720 موبائل: 0345-4327063

خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیار کا کام کرتی ہیں۔
دنیا پر کتابیں ہی حکومت کرتی رہی ہیں۔

Mob: 0345-4327063
Ph : 042-37027720

ناشر:
حفیظ گوھر

نام کتاب	....	مضامینِ پطرس
مصنف	....	سیّد احمد شاہ پطرس بخاری
سرورق	....	عبید اللہ
کمپوزنگ	....	وِز کمپوزنگ سنٹر
تعداد	....	1000
قیمت	....	150 روپے

حفیظ گوہر نے بھٹو پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر
گوہر پبلی کیشنز، اُردو بازار لاہور سے شائع کی۔

فہرست

دیباچہ

اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اگر اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں۔ حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد مُتکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ وہ بھی "ہر چند کہیں کے ہیں نہیں ہیں" آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں۔ جنھوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں۔ وہ پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کر لیں۔

"پطرس"

دیباچہ

اسلام میں خندہ پیشانی نہ صرف سنت نبوی ﷺ ہے بلکہ اسے جبینِ انسانی کا وہ لازمی جھومر مانا گیا ہے جس کے بغیر مکمل شخصیت نہیں ہو سکتی۔ پیشانی کے خندہ ہونے کے ساتھ ساتھ ذہن خندہ ہونا بھی نعمت خداوندی ہے۔ نچی ادبیات میں مزاحیہ ادب انسان کو خندہ پیشانی و خندہ ذہنی دونوں سے نوازتا ہے۔ سچا مزاح نگار وہی ہے جس کی تخلیقات قاری و سامع کے ذہن و پیشانی دونوں پر مسکراہٹیں رقم کر دے۔ سخن میں اکبر الہٰ آبادی کے سر پر اردو شعری طنز و مزاح کا سب سے بڑا تاج رکھا ہے۔ نثری ادب میں طنز و مزاح کے اپنے اپنے اسلوب کے حوالے سے چند ادیبوں کے سروں پر اپنی اپنی انفرادیت کا تاج سر نشین دکھائی دیتا ہے۔ ان میں اُردو کے عظیم الشان مزاح نگار سید احمد شاہ المعروف پطرس بخاری (پشاور یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء نیویارک ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء) کا نام' تاریخ ادب مزاحیہ کا لازمی باب ہے۔

''پطرس کے مضامین'' کی نہ صرف پہچان ہے بلکہ ان کے زندۂ جاوید ہونے کا سامان بھی ہوئے۔ پاک و ہند برصغیر میں پطرس پر اُردو میں کافی کام کیا گیا ہے۔ جس میں ان کے مضامین کی بار بار اور ہمہ جہت اشاعت بھی شامل ہیں۔ اردو ادب اور زبان کے تمام اہل انعامات میں پطرس مضامین کو شمول حاصل ہے۔ قاریانِ ادب ہوں یا اساتذہ وطلبائے زبان و ادب' مضامین پطرس کی ضرورت سب کو تھی' ہے اور رہے گی۔ شاید یہ ہی وجہ ہے کہ ہر اچھے ناشر کی خواہش رہتی ہے کہ ''پطرس کے مضامین'' ان کی زندگی کے حالات اور ان سے مستعار تحاریر کو نشر و اشاعت کا حصہ ضرور بنائے۔ چنانچہ حفیظ گوہر نے بھی اپنے ادارے گوہر پبلی کیشنز کو اس نیک کام سے محروم نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے نہ صرف ''پطرس کے مضامین''

کی اشاعتِ مکرر کا بیڑہ اٹھایا ہے بلکہ طلباء اور قاری حضرات کی آسانی کے لئے پطرس کے مضامین کے ساتھ ساتھ مشکل الفاظ کے معانی پر مبنی مختصر فرہنگ بھی شامل کی ہے اس سے طلباء اور عام قاری کو نہ صرف مضامین سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ پطرس کے ضمن میں بھی معاونت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ برادرم حفیظ گوھر کو اس طرح کے کارآمد کارہائے نمایاں کرتے رہنے کی توفیق عطا فرماتا رہے۔ (آمین ثم آمین)۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد افضال (پی ایچ ڈی علیگ)
سابق ڈین آف ایشیئن انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن سائنسز گلبرک لاہور
سابق یو۔جی۔سی۔فیلو آف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
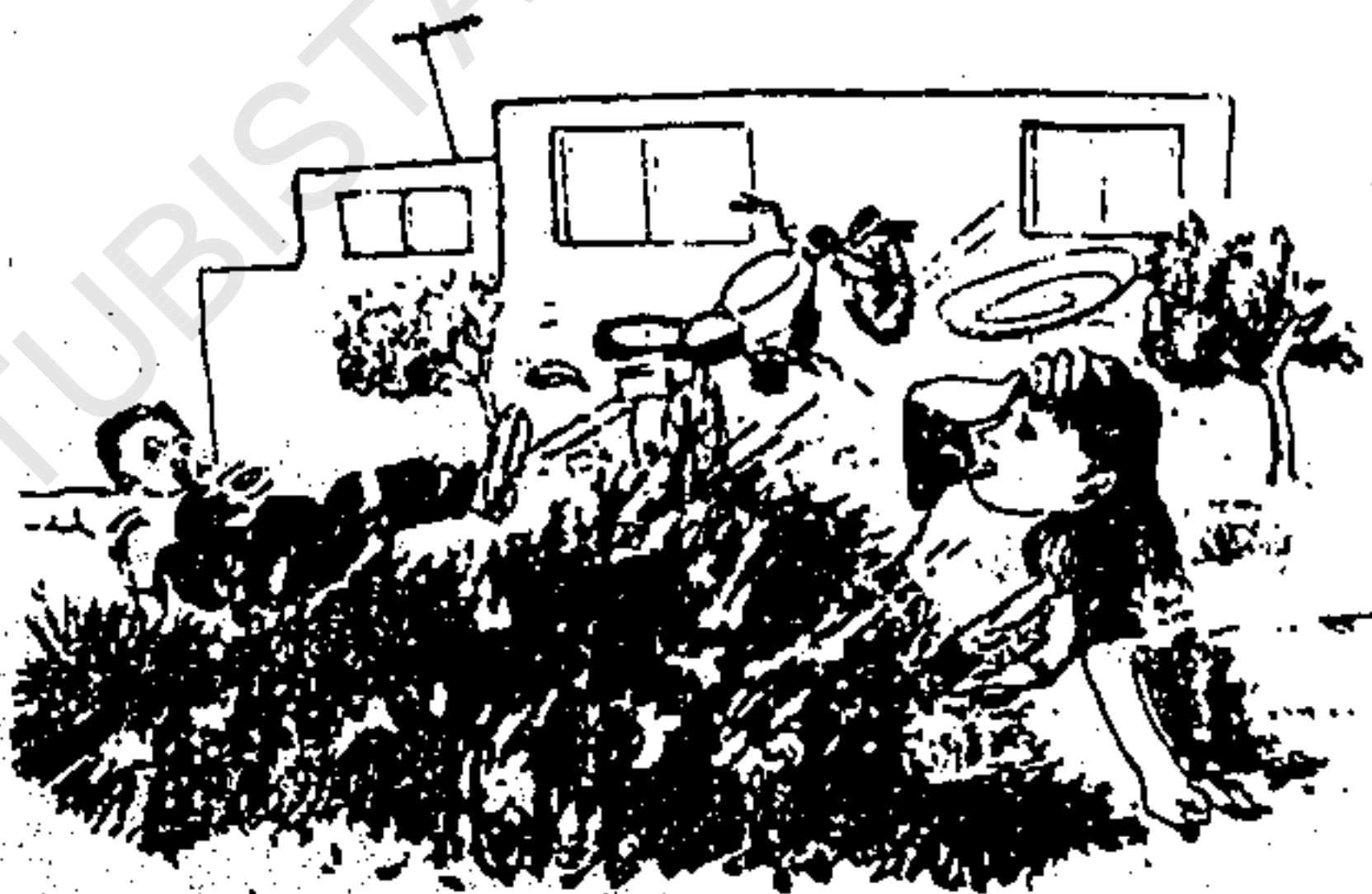
پروفیسر سید احمد شاہ پطرس بخاری

پطرس بخاری یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام سید اسد اللہ شاہ تھا وہ پشاور میں ایک وکیل کے منشی تھے۔ پطرس بخاری کا اصل نام سید احمد شاہ تھا۔ ابتدائی تعلیم پشاور میں حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے انگلش کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا اس کے علاوہ وہ کالج کے ادبی رسالہ ''راوی'' کے مدیر بھی رہے۔ ۱۹۱۳ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ڈگری حاصل کی وطن واپس آئے اور سنٹرل ٹریننگ لاہور میں اُستاد مقرر ہوئے۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب پڑھانے لگے۔

۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۷ء پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے سیکریٹری بھی رہے۔

۱۹۳۷ء میں جب آل انڈیا ریڈیو کا قیام عمل میں آیا تو محکمہ تعلیم سے ان کی خدمات مستعار لے لیں گئیں۔ ۱۹۴۰ء تک وہ اس محکمہ میں ڈائریکٹر جنرل تک پہنچ گئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ریڈیو پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر جنرل ان کے چھوٹے بھائی زیڈ اے بخاری تھے۔ ۱۹۵۰ء میں پطرس بخاری کو اقوام متحدہ میں پاکستان کا مستقل نمائندہ بنا کر بھیجا گیا اور وہ اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ سیکریٹری جنرل کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ شمالی افریقہ کے ملک تیونس کی آزادی کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش ہوا تو پطرس بخاری نے مکمل طور پر اُس کی حمایت کی۔ حتیٰ کہ قرارداد منظور کروائی۔ اہل تیونس نے اپنے ملک میں اُن کی ایک یادگار قائم کی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں وہ اقوام

متحدہ کے شعبۂ اطلاعات میں ڈپٹی سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں اُن کی ریٹائرمنٹ تھی اور انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں بطور پروفیسر خدمات سرانجام دینا تھیں لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو نیویارک میں حرکت قلب بند ہونے سے اُن کا انتقال ہوگیا۔اور انہیں نیویارک ہی میں سپرد خاک کردیا گیا۔

طنز کے معانی طعنہ، ہنا، ٹھٹھ، تمسخر، رمز کے ساتھ بات کرنا اور مزاح کے معانی خوش طبعی، مذاق، ہنسی، خوش طبعی کرنا۔ گوکہ یہ الگ الگ معانی رکھنے والے لفظ ہیں۔طنز تلخ اور مزاح میں مٹھاس کا عنصر پایا جاتا ہے۔اس لئے مزاح نگاران دونوں کو ملا کر فرد یا معاشرے کی اصلاح اور خوش طبعی کا کام کرتا ہے۔ کیونکہ طنز ایک نشتر کی حیثیت رکھتا ہے جب اس کے ساتھ مزاح کی چاشنی لگتی ہے تو اس کی اذیت میں کمی ہو جاتی ہے۔ مزاح اکیلا بھی کارگر ثابت ہو سکتا ہے مگر طنز مزاح کے بغیر کارگر نہیں کیونکہ مزاح کے بغیر طنز ایک کڑوی گولی بن جاتا ہے۔

طنز و مزاح اُردو ادب کی کوئی مخصوص صنف نہیں بلکہ یہ دو صفات ہیں اس لئے ان کا استعمال نظم اور نثر دونوں میں ہوتا ہے۔ اُردو نثر میں سب سے پہلے طنز و مزاح غالب کے خطوط میں دیکھنے کو ملا اس کے بعد مزاح کی اولین تحریک اور رسالہ ''اودھ پنچ'' کے مزاح نگاروں کی طویل فہرست ہے جس میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی جواہر پرشاد برق اور سید محی آزاد وغیرہ اس کے بعد پطرس بخاری، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، ملا رموزی اور شوکت تھانوی وغیرہ۔ دورِ جدید کے مزاح نگاروں میں ابن انشاء، کرنل محمد خان، شفیق الرحمٰن، ضمیر جعفری، عطاء الحق قاسمی اور مشتاق احمد یوسفی شامل ہیں۔

پروفیسر پطرس بخاری اُردو، انگریزی، فارسی، فرانسیسی اور پشتو زبان پر عبور رکھتے تھے اُردو ادب میں طنز و مزاح کی دنیا میں پطرس بخاری کو ایک سورج کی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے غیر ملکی ڈراموں کے اُردو تراجم کیے خصوصاً شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار برنارڈ شاہ کے ڈراموں کا اُردو ترجمہ کیا۔

اُن کی کتاب ''پطرس کے مضامین'' کو جو مقام حاصل ہوا وہ ادب کے مزاحیہ سرمائے میں قابل قدر نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور بلاشبہ پطرس بخاری کو اُردو ادب میں مزاح کے سب سے بڑے علمبردار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وہ اپنے مضامین میں صرف طنز کے نشتر ہی نہیں چلاتے بلکہ تفریح طبع اور ہنسی مذاق میں فرد اور معاشرے کی خامیوں کو بیان کرتے اور اس کی اصلاح کا پہلو اجاگر کرتے جاتے ہیں یعنی ان کے مزاح میں بھی ہمدردی کا عنصر پایا جاتا ہے پیروڈی یا تحریف نگاری میں بھی پطرس اپنا ثانی نہیں رکھتے اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اُردو میں سب سے پہلے پیروڈی کو متعارف کروایا۔

پطرس کی زبان و بیان میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک اعلیٰ درجے کے نثار اور مزاح نگار میں ہونی چاہیئں۔ مثلاً سادگی، اختصار، روانی، شگفتگی، فقرات و محاورات کا برجستہ استعمال، موضوعات، کردار نگاری، لطیف طنز اور میٹھا مزاح۔

زیر نظر کتاب ''پطرس کے مضامین'' گیارہ مضامین پر مشتمل تھی لیکن اب اس میں میں نے مزید گیارہ مضامین اور شامل کیے ہیں۔ جو مختلف ادوار میں مختلف رسائل کی زینت بنتے رہے۔

از

حفیظ گوھر

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں یہی حالت ہماری تھی ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھوں۔ مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مرزا ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے "بھئی! کچھ ہوگا ہی نا! آخر"

میں نے کہا "میں بتاؤں تمہیں" کہنے لگے "بولو"

میں نے کہا ''کوئی فرق نہیں' سنتے ہو مرزا؟ کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں۔۔۔۔۔کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں ہاں! میں جانتا ہوں تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو' کہہ دو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں تم جگالی نہیں کرتے' ان کی دم ہوتی ہے تمہاری دم نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں۔ لیکن ایک بات میں میں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں میں بھی پیدل چلتا ہوں اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے۔ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو بس چپ ہو جاؤ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔ پیدل! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے سینہ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اُٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے' ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم! اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا حواس بیکار ہو جاتے ہیں تخیل مرجاتا ہے آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔''

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگرٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے پروائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے ازحد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں۔ یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں۔ یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں میں نے دل میں کہا ''اچھا مرزا یوں ہی سہی دیکھو! تو میں کیا کرتا ہوں۔''

میں نے اپنے دانت پیچ کر لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا میں مسکرا دیا لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

''مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں بڑے استغناء کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے ''کیا کہا تم نے' کیا خریدنے لگے ہو؟''

میں نے کہا "سنا نہیں تم نے' میں ایک موٹر کار خرید نے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں۔ بعض لوگ کار کہتے ہیں لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو اس لیے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیے تا کہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

مرزا بولے "ہوں"

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگرٹ پینے لگا بھنویں میں نے اُوپر کو چڑھا لیں' سگرٹ والا ہاتھ میں منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔ تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے "ہوں"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے میں چاہتا تھا کہ مرزا کچھ بولے تا کہ مجھے معلوم ہو کہ یہاں تک مرعوب ہوا ہے لیکن مرزا نے پھر کہا "ہوں"

میں نے کہا "مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور پھر گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی سکول اور کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو مرزا اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔

مرزا صاحب کہنے لگے "نہیں یہ بات تو نہیں میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لیے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا "میں اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں۔"

مرزا بولے "کون کون سی مثلاً؟"

میں نے کہا "ایک تو میں اپنا سگرٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔"

مرزا کہنے لگے "چلو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے روک دیا

جائے۔چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔بہت سوچا آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے"میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں ایک بائیکل لے لو۔"

میں نے کہا"وہ روپیہ کا مسئلہ تو جوں کا توں رہا۔"

کہنے لگے"مفت"

میں نے حیران ہو کر پوچھا"مفت؟ وہ کیسے؟"

کہنے لگے"مفت ہی سمجھو۔آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے؟"

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوشی، دلی اُبلتے ہوئے فواروں کی موسیقی اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔اس سے محفوظ ہوں تو میں نے پوچھا"ہے کس کی؟"

مرزا بولے"میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے تم لے لو۔"

میں نے کہا"پھر کہنا، پھر کہنا!"

کہنے لگے"بھئی! ایک بائیسکل میرے پاس ہے جب میری ہے تو تمہاری ہے۔تم لے لو۔"

یقین مانیے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔شرم کے مارے مَیں پسینہ پسینہ ہو گیا۔چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کر لی۔سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا"مرزا سب سے پہلے میں اس گستاخی اور دُرشتی اور بے ادبی کے لیے معافی مانگتا ہوں جو ابھی ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی۔دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد

دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو از حد کمینہ' ممسک' خودغرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو! ناراض مت ہونا۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابلِ نفرت' تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں مجھے معاف کر دو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس کی گود میں سر رکھ دیتا۔ لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

"واہ! اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے جیسے میں سوار ہوا ویسے تم سوار ہوئے۔"

میں نے کہا "مرزا مفت میں نہ لوں گا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "بس اسی بات سے میں ڈرتا تھا تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارہ نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے احسان اس میں کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "خیر کچھ بھی سہی تم سچ مچ مجھے اس کی قیمت بتا دو۔"

مرزا بولے "قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی وہ تو بہت زیادہ تھی' اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے "میں نے پونے دو سو روپے میں لی تھی لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا اس لیے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔"

میں نے کہا "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے "نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوتی۔ میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں۔ جنہیں کالج کے سر پھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔"

"مگر مرزا صاحب پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔"

مرزا کہنے لگے ''تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں۔اول تو قیمت لینا نہیں چاہتا لیکن۔۔۔۔۔

میں نے کہا'' نہ مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی اچھا تم یوں کرو میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں تم گھر جا کر گن لینا۔اگر تمہیں منظور ہو جائے تو کل بائیسکل بھیج دینا ورنہ روپے واپس کر دینا۔اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں۔یہ تو کچھ دکانداروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔''

مرزا بولے'' بھئی! یہ تمہاری مرضی میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔''

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔وہ بیچارا تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو۔لیکن مفت میں کیسے لے لوں آخر بائیسکل ہے ایک سواری ہے۔فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔بکس کو کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں۔چھیالیس روپے تو ٹھیک رقم نہیں۔پینتالیس یا پچاس ہوں جب ہی بات ہے۔پچاس تو ہو نہیں سکتے اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس ہی کیوں نہ دیئے جائیں۔جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول ہوتی ہیں۔بس ٹھیک ہے چالیس روپے دے دوں گا۔خدا کرے مرزا قبول کر لے۔

باہر آیا چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور کہا'' مرزا اس کی قیمت نہ سمجھنا لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔''

مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا کہ مرزا کل ضرور صبح ہی صبح بھجوا دینا۔رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا'' کل صبح آٹھ نو بجے پہنچ جائے۔دیر نہ کرنا۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔۔۔اور دیکھو! مرزا میرے تھوڑے سے روپیوں کو بھی زیادہ سمجھنا۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔۔۔اور تمہارا بہت بہت شکریہ۔میں تمہارا ممنون ہوں اور میری گستاخی کو معاف کر

دینا۔ دیکھو! نا! کبھی کبھی یونہی بے تکلفی میں۔۔۔۔۔ کل صبح آٹھ نو بجے تک۔۔۔۔۔ ضرور۔۔ خدا حافظ۔"

مرزا کہنے لگے" ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا اور تیل وغیرہ ڈلوا لینا۔ میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوا دوں گا ورنہ تم خود ڈلوا لینا۔

میں نے کہا" ہاں ہاں! وہ سب کچھ ہو جائے گا تم کل ضرور بھیج دینا اور دیکھنا آٹھ بجے تک یا ساڑھے سات بجے تک پہنچ جائے اچھا۔۔۔۔ خدا حافظ!"

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر اردگرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح ہوا خوری کے لیے ہر روز نہر تک جایا کروں گا شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے۔ میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہو گا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہا ہے۔ وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ بارہا دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگا لوں۔

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا! مرزا بائیسکل دینے پر رضا مند ہو جائے۔ صبح اٹھا تو اٹھتے کے ساتھ ہی نوکر نے یہ خوشخبری سنائی کہ حضور وہ بائیسکل آ گئی ہے۔

میں نے کہا" اتنی سویرے۔"

نوکر نے کہا" وہ تو رات ہی کو آ گئی تھی آپ سو گئے تھے میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔"

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا۔ لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں۔ روپے لے لیے تھے تو بائیسکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر نے کہا ''دیکھو! یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو! بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑ دو اور یہ موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھتا ہے۔اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ اور دیکھو! ابے بھاگا کہاں جا رہا ہے۔ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا اور بائیسکلوں والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دے دے جس سے تمام پرزے ہی خراب ہو جائیں۔بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں اور بائیسکل باہر نکال کر رکھو ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں ہم ذرا سیر کو جا رہے ہیں اور دیکھو! صاف کر دینا اور بہت زور زور سے کپڑا ابھی مت رگڑنا بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔''

جلدی جلدی چائے پی۔غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ ''چل چل چنبیلی باغ میں'' گاتا رہا۔اس کے بعد کپڑے بدلے' اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کیساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی۔ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے نوکر سے دریافت کیا ''کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟''

نوکر بولا ''حضور یہ بائیسکل ہے۔''

میں نے کہا ''بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟''

کہنے لگا ''مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لیے۔''

میں نے کہا ''اور جو بائیسکل رات کو انہوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟''

کہنے لگا ''یہی تو ہے۔''

میں نے کہا '' کیا بکتا ہے جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی وہ بائیسکل یہی ہے؟''

کہنے لگا ''جی ہاں!''

میں نے کہا ''اچھا'' اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

''اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟''

''حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔''

"تو یہ میلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

"اور تیل لایا؟"

"ہاں! حضور لایا ہوں۔"

"دیا"

"حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں وہ نہیں ملتے۔"

"کیا وجہ؟"

"حضور دُھروں پر میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ میں ہی دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے۔ لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ کل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا۔ جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا لیکن اب اس سوراخ میں سے آمدورفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا "حضور وہ تیل تو سب اِدھر اُدھر بہہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اُوپر اُوپر ہی ڈال دو یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

آخر کار سائیکل پر سوار ہوا پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں چاں چوں قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ، کھڑ کھڑ کی قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چر۔ چرخ۔ چر۔ چرخ کی قسم کے سر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی میں جب کبھی پیڈل پر دباؤ ڈالتا تھا۔ زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی

تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑتا جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کی مدد سے صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ قدرے زمین سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے سے چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ۔۔۔۔۔ کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر بائیسکل ذرا زیادہ تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے۔ بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر ادھر کے لوگ چونکے ماؤں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ کھڑڑ کھڑڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی۔ لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لیے چوں چوں پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ چچوں پھٹ چچوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی اڈق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا۔ لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتہً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لیے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹھکیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہونا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کر لوں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر باہر آگیا ہوں جیب سے میں نے اوزار نکالا۔ گدی کو اونچا کیا کچھ ہینڈل کو ٹھیک

کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم سامنے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو معلوم ہو گا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لیے میری مصیبت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا "دیکھو! یہ آدمی کیا کر رہا ہے۔" گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو اونچا کیا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں۔ بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کے گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل؟ چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کر لی تو میں نے فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی کھڑ کھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے۔ سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا "ذرا اس کی مرمت کر دیجئے۔"

ایک مستری آگے بڑھا لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھوک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے لیکن پھر مجھ سے پوچھنے لگا "کس کس پرزے

کی مرمت کرائیے گا۔"

میں نے کہا" بڑے گستاخ ہو تم دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا نیچا کروا کے کسوانا ہے۔بس اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کہ کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا" مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں؟"

میں نے کہا" ہاں! وہ بھی ٹھیک کر دو۔"

کہنے لگا" اگر باقی چیزیں بھی ٹھیک کرا لیں تو اچھا ہو۔"

میں نے کہا" اچھا کر دو۔"

بولا" یوں تھوڑی ہو سکتا ہے۔دس پندرہ دن کا کام ہے آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

" اور پیسے کتنے لو گے؟"

کہنے لگا" بس تیس چالیس روپے لگیں گے۔"

ہم نے کہا" بس جی جو کام تم سے کہا ہے کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔میں چلنے لگا تو مستری نے کہا۔" میں نے تو کس دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ابھی تھوڑی دیر بعد پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا" ہیں! بدتمیز کہیں کا۔تو دو آنے پیسے مفت میں لے لئے؟"

بولا" جناب! آپ کو بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہو گی۔یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا!؟......للو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔پہچانی تم نے؟ بھئی! صدیاں ہی گزر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا" واہ! مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔"

مستری نے کہا" ہاں! وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے

تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی۔''

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہو گئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا۔ لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس لیے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جا بجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا ورنہ میں پاگل ہو جاتا اور جنوں کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا۔ جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغا بازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا۔ اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے، اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں کو بیچ کر جو وصول ہو، اسی پر صبر شکر کروں، بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک دکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ ''یہ بائیسکل ہے۔''

دکاندار کہنے لگا ''پھر''

میں نے کہا ''لو گے؟''

کہنے لگا ''کیا مطلب؟''

میں نے کہا ''بیچتے ہیں ہم''

دکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا پھر مجھے دیکھا پھر بائیسکل کو دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کونسی ہے آخر کار بولا ''کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر۔''

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے میں نے کہا ''کیا یہ پوچھنا چاہتے ہو

کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے ان کا مصرف کیا ہوگا؟"

کہنے لگا "وہ تو ٹھیک ہے مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟"

کہنے لگا "اچھا! چڑھ گیا پھر؟"

میں نے کہا "پھر کیا؟ پھر چلائے اور کیا؟"

دکاندار بولا "اچھا؟ ہوں! خدا بخش ذرا یہاں آنا یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا انہوں نے بائیسکل کو دور سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہیں۔

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا۔میرے پاس آئے اور کہنے لگے "تو آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں؟"

میں نے کہا "تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لیے میں گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا؟"

کہنے لگا "تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا "تمہیں بتاؤ۔"

کہنے لگا "سچ مچ بتاؤں؟"

میں نے کہا "ہاں!"

پھر کہنے لگا "سچ مچ بتاؤں؟"

میں نے کہا "اب بتاؤ گے بھی یا یونہی ترساتے رہو گے؟"

کہنے لگا "تین روپے دوں گا اس کے"

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے میں نے کہا۔

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان! مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے۔اس کے لیے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا اور اندھا

دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اچھل کے مجھ سے آ لگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا اور ادھر ادھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کیساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں۔ گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ اردگرد کچھ لوگ جمع تھے جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گردوپیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی بائیسکل میرے پاس پڑی ہے میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیہ الگ ہو گیا تھا اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی ورنہ حاشا وکلا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لئے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے؟ یہ دو پہیے کا ہے کو لے جا رہے ہو؟

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں انہیں ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا محض ایک حادثہ بس دائیں بائیں مت دیکھو چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے ایک آواز آئی۔ ''بس حضرت غصہ تھوک ڈالیے۔'' ایک دوسرے صاحب بولے ''بے حیا بائیسکل گھر پہنچ کے تجھے مزہ چکھاؤں گا۔'' ایک والد اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔ ''دیکھو! بیٹا یہ سرکس کی بائیسکل ہے اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں؟''

لیکن میں چلتا گیا تھوڑی دیر کے بعد آبادی سے دور نکل آیا اب میری رفتار میں ایک عزمیت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کشمکش میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اب

بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں چلتا گیا' چلتا گیا۔ حتیٰ کہ دریا پر پہنچا پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا مرزا بولے'' اندر آ جاؤ۔''

میں نے کہا'' آپ ذرا باہر تشریف لائیے میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کئے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں؟''

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزاران کی خدمت میں پیش کیا جو انہوں نے بائیسکل کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عنایت فرمایا تھا اور کہا۔

'' مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجئے میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔''

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف۔اے۔ میں پڑھی تھی۔

☆☆☆

فرہنگ

حواس: ہوش، اوسان، عقل، سمجھ، حاسہ کی جمع۔ تخیل: خیال، تصور، قیاس، شبہ، شک جمع تخیلات۔ استغناء: بے پروائی، بے نیازی، بے فکری۔ گھڑوں پانی پڑنا: نہایت شرمندہ ہونا، شرم کے مارے پسینہ پسینہ ہو جانا۔ درشتی: سختی، بے رحمی، بدخلقی۔ ممسک: پکڑنے والا، روکنے والا، کنجوس، بخیل۔ فٹنوں: فٹن (Phaeton) ایک قسم کی چار پہیوں کی بگھی۔ معترض: اعتراض کرنے والا، روک ٹوک کرنے والا۔ ہست و بود: قیام و وجود، حیات و زندگی۔ ڈھبریاں: ڈھبری، پیچ کے اوپر کا لوہا جس کو پھیر کر پیچ کو کس دیتے ہیں۔

میبل اور میں

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی۔لیکن ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے۔اس لئے اکثر لیکچروں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے۔کئی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔تصویروں اور موسیقی کا شوق اسے بھی تھا۔میں بھی ان میں ہمہ دانی کا دعویدار۔اکثر گیلریوں یا کانسرٹوں میں اکٹھے جایا کرتے تھے۔دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے۔کتابوں کے متعلق باہم بحث مباحثے رہتے۔ہم میں سے اگر ایک کوئی نئی کتاب یا نیا مصنف ''دریافت'' کرتا تو دوسرے کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتا اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے برے کا حکم صادر کرتے۔لیکن اس تمام یک جہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی۔ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پرورش پائی تھی۔عورت اور مرد کی مساوات کے قائل تو ضرور تھے۔تاہم اپنے خیالات میں اور بعض اوقات اپنے رویے میں ہم کبھی نہ کبھی اس کی تکذیب ضرور کر دیتے تھے۔بعض حالات کے ماتحت میبل ایسی مراعات کو اپنا حق سمجھتی جو صرف صنف ضعیف ہی کے ایک فرد کو ملنی چاہئیں اور بعض اوقات میں تحکم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتا جس کا مطلب یہ تھا کہ گویا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میرا فرض یہی ہے۔خصوصاً مجھے یہ احساس بہت زیادہ تکلیف دیتا تھا کہ میبل کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے۔اس سے میرے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشیائی آباؤ اجداد کا خون جوش مارتا اور میرا دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے۔اس طرف میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی۔یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کو

کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض کے برابر سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیوں کر نظر انداز کرتا کہ میبل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی اور ہفتہ بھر کے بعد انہیں میرے کمرے میں پھینک کر چلی جاتی اور ساتھ ہی کہہ جاتی کہ میں انہیں پڑھ چکی ہوں تم بھی پڑھ چکو گے تو ان کے متعلق باتیں کریں گے۔

اول تو میرے لیے ایک ہفتہ میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا۔ لیکن فرض کیجئے مردوں کی لاج رکھنے کے لئے راتوں کی نیند حرام کر کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو بھی ان میں دو یا تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ایسی ہوتیں کہ ان کے سمجھنے کے لئے کافی عرصہ درکار ہوتا۔ چنانچہ ہفتہ بھر کی جانفشانی کے بعد مجھے ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی میں کچھ کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا اور وہ نہایت عالمانہ انداز میں بھنویں اوپر کو چڑھا چڑھا کر باتیں کرتی۔ جب میں اس کے لئے دروازہ کھولتا یا اس کے سگرٹ کے لئے دیا سلائی جلاتا یا اپنی سب سے آرام دہ کرسی اس کے لئے خالی کر دیتا تو وہ میری خدمات کو حق نسوانیت نہیں بلکہ حق اُستادی سمجھ کر قبول کرتی۔

میبل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصے میں تبدیل ہو جاتی۔ جان یا مال کا ایثار سہل ہے لیکن آن کی خاطر نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور ناجائز ذرائع کے استعمال پر اتر آتا ہے۔ اسے میری اخلاقی پستی سمجھئے۔ لیکن یہی حالت میری بھی ہو گئی۔ اگلی دفعہ جب میبل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نہیں پڑھی تھیں۔ ان پر بھی میں نے رائے زنی شروع کر دی۔ لیکن جو کچھ کہتا تھا۔ سنبھل سنبھل کر کہتا تھا۔ تفصیلات کے متعلق کوئی بات منہ سے نہ نکالتا تھا۔ سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدت کا رنگ دیتا تھا۔

کسی ناول کے متعلق میبل نے مجھ سے پوچھا تو جواب میں نہایت لاابالیانہ کہا۔

"ہاں! اچھی ہے لیکن کوئی ایسی اچھی بھی نہیں۔ مصنف سے دور جدید کا نقطۂ نظر کچھ نبھ نہ سکا۔ لیکن پھر بھی بعض نکتے نرالے ہیں بری نہیں، بری نہیں۔"

کنکھیوں سے میبل کی طرف دیکھتا گیا۔ لیکن اسے میری ریاکاری بالکل معلوم نہ

ہونے پائی' ڈرامے کے متعلق کہا کرتا تھا۔

"ہاں! پڑھا تو ہے لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے وہ اسٹیج پر جا کر بھی باقی رہے گا۔ یا نہیں؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی اور گفتگو کا بار بھی میبل کے کندھوں پر ڈال دیتا۔ تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا:

"اس نقاد پر اٹھارہویں صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یونہی نامعلوم سا۔ کہیں کہیں' بالکل ہلکا سا اور شاعری کے متعلق اس کا رویہ دلچسپ ہے۔ بہت دلچسپ' بہت دلچسپ۔"

رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا۔ جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا۔ اس پر خود حیران رہ جاتا تھا۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوئی۔

اب میں میبل سے نہ دبتا تھا اسے بھی میرے علم وفضل کا معترف ہونا پڑا۔ وہ اگر ہفتہ میں دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں صرف دو دن کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا۔ میری مردانہ روح میں اس احساس فتح مندی سے بالیدگی سی آ گئی تھی۔ اب میں اس کے لئے کرسی خالی کرتا یا دیا سلائی جلاتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ۔ جیسے ایک طاقتور تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو۔

صراط المستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں' تو نہ سراہیں۔ لیکن میں کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں۔ خواتین میری اس حرکت کے لئے مجھ پر دہری لعنتیں بھیجیں گی کہ ایک تو میں نے مکاری اور جھوٹ سے کام لیا اور دوسرے ایک عورت کو دھوکا دیا۔ ان کی تسلی کے لیے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانیے کئی دفعہ تنہائی میں' میں نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ ساتھ ہی اس بات کا بھلانا بھی مشکل ہو گیا کہ میں بغیر پڑھے ہی کے علمیت جتاتا رہتا ہوں۔ میبل تو یہ سب کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے تو بہر حال اس کو مجھ پر تفوق

تو ضرور حاصل ہے۔ میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے نا! کہ میں وہ کتابیں نہیں پڑھتا۔ میری جہالت اس کے نزدیک نہ سہی میرے اپنے نزدیک تو مسلم ہے اس خیال سے اطمینان قلب پھر مفقود ہو جاتا اور اپنا آپ ایک عورت کے مقابلے میں پھر حقیر نظر آنے لگتا۔ پہلے تو میبل کو صرف ذی علم سمجھتا تھا اب وہ اپنے مقابلے میں پاکیزگی اور راستبازی کی دیوی بھی معلوم ہونے لگی۔

علالت کے دوران میں میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ بخار کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بھی بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صحت یاب ہو کر مجھے اپنی کمزوری پر ہنسی آتی ہے لیکن اس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بدقسمتی کہ انہی دنوں مجھے خفیف سا انفلوائنزا ہوا۔ مہلک نہ تھا بہت تکلیف دہ بھی نہ تھا۔ تاہم گزشتہ زندگی کے تمام چھوٹے چھوٹے گناہ گناہِ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ میبل کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت ملامت کی اور میں بہت دیر تک بستر پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ شام کے وقت میبل کچھ پھول لے کر آئی۔ خیریت پوچھی' دوا پلائی' ماتھے پر ہاتھ رکھا میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے میں نے کہا (میری آواز بھرائی ہوئی تھی) ''میبل مجھے خدا کے لئے معاف کر دو۔'' اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے میں نے اپنی مکاری کی ہر ایک تفصیل کو بیان کیا ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھنے کے لمبی لمبی فاضلانہ تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا ''میبل پچھلے ہفتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کرتا رہا ہوں لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔ میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہو گی جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہو گا۔''

کہنے لگی ''نہیں تو۔''

میں نے کہا ''مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ کیرکٹروں کے متعلق میں جو کچھ بک رہا تھا وہ سب من گھڑت تھا۔''

کہنے لگی ''کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔''

میں نے کہا ''پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ڈھیلا ہے

یہ بھی ٹھیک تھا؟''

کہنے لگی ''ہاں پلاٹ کہیں کہیں ڈھیلا ضرور ہے۔''

اس کے بعد میری گذشتہ فریب کاری پر وہ اور میں دونوں ہنستے رہے۔میبل رخصت ہونے لگی تو بولی ''تو وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟''

میں نے کہا ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کرنے کا موقع تو دو میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا۔لیکن اب میں انہیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔انہیں یہیں رہنے دو تم تو انہیں پڑھ چکی ہو۔

کہنے لگی ''ہاں! میں تو پڑھ چکی ہوں اچھا میں یہیں چھوڑ جاتی ہوں۔''

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی دفعہ کھولا۔تینوں میں سے کسی ایک کے ورق تک نہ کٹے تھے۔میبل نے بھی انہیں ابھی تک نہ پڑھا تھا۔

مجھے مرد اور عورت دونوں کی برابری میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

☆☆☆

فرہنگ

ہمہ دانی: ہر کام کی واقفیت، گیلریوں: گیلری کی جمع (Gallery) ، دالان، برآمدہ، شہ نشین، تھیٹر، تصویر خانہ، رنگ محل۔تکذیب: جھٹلانا، جھوٹ بولنے کا الزام لگانا۔تحکم: حکم کرنا، حکومت کرنا، زبردستی کی حکومت۔آسودگی: امن و امان: چین، آرام، راحت، دولت مندی، فارغ البالی۔معترف: اعتراف کرنے والا، اقرار کرنے والا، اقبال۔بالیدگی: افزائش، بڑھوتری، روئیدگی۔تفوق: برتری، فوقیت، فضیلت، بڑائی۔مفقود: کھویا ہوا، غائب، ناپید، ندارد، انفلوائنزا (Influenza)، وبائی زکام، فلو۔تائب: توبہ کرنے والا، گناہ سے باز آنے والا۔

کُتّے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا۔ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجیے دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجیے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب! وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب! ایک کہنہ مشق اُستاد کو جو غصہ آیا۔ ایک حلوائی کے چولہے سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدرشناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کم بخت بعض تو دوغزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر" "آرڈر" پکارا۔ لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے، یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کونسی شرافت ہے۔

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان

میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے۔اس کا ذکر ہی جانے دیجئے اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔خدا کی قسم! ان کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے، کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سر نہ سر نہ پیر۔تان پہ تان لگائے جاتے ہیں بے تالے کہیں کے۔نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں۔گلے بازی کیے جاتے ہیں۔گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں لیکن ہم سے قسم لے لیجئے جو ایسے موقعوں پر ہم نے کبھی سیتہ گرہ سے منہ موڑا ہو۔شاید آپ اس کو تعلی سمجھیں۔لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اُٹھ ہی نہ سکا۔اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیے کہ دافع بلیات ہے۔لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔یہ البتہ ٹھیک ہے ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کی سروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اتر جائے گی۔اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں اور نومشقی کا عالم بھی ہے۔اس لیے سیٹی پر اکتفا کیا ہے کہ بے سرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا کہ انگریزی موسیقی ہے اتنے میں ایک موڑ پر سے جو

مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو۔آنکھوں نے اُسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لَے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لیے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگزشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا ہے کہ "اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو۔" لیکن۔۔۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگ رہ بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں۔ سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں۔ یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں، بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لیے بھونک لے تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی! بھونک (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہونا چاہیے) لیکن یہ کم بخت دو روزہ سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں، چلتی موٹر کے سامنے آ کر گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں۔ لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کر دے گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آ کر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے

ہیں؟ ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرِ لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی۔ سکنات ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مارے گا؟ بہرصورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابل نفرین رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آ کر کہہ دے کہ عالی جناب! سڑک بند ہے تو خدا کی قسم! ہم بغیر چون و چرا کیے واپس لوٹ جائیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینی حرکت ہے۔ (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں)۔

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کیے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے کہ گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لیے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا۔ گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا۔ لوگوں سے کہلوایا خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سُرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورت حالات کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کیخلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دم کو تا بحد امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا۔ انہوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر

دی۔'' بچہ! فقیروں کو چھیڑتا ہے نظر نہیں آتا ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔'' بس اس فقیر کی بددعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لیے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لیے کسولی پہنچ جائے۔ ایک شعر ہے۔

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزق گدارا

یہی وہ خلاف فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لیے باعث ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ'' بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے'' یہ بجا سہی۔ لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

☆☆☆

فرہنگ

سلوتریوں: سلوتری کی جمع، گھوڑوں کا ڈاکٹر۔ کہنہ مشق: تجربہ کار، مشاق۔ فی البدیہہ: فوراً، فی الفور، بے سوچے۔ پردھان: رہنما، صدر، مکھیا۔ تعلّی: بلندی، ترقی، برتری، بزرگی، بڑائی۔ بلیات: بلیہ کی جمع، بلائیں، مصیبتیں۔ تھوتھنی: جانور کا منہ، (حقارت سے) انسان کا منہ۔ مُصِر: اصرار کرنے والا، کسی چیز پر اڑ جانے والا، ضدی۔ اسفند یار: قدرت حق، لطفِ خدا، ایران کے ایک بادشاہ کا نام۔ نفرین: ملامت، پھٹکار، لعنت۔ کلیے: کلیہ، گروہ، ایک اندرونی عضو۔ رعشہ: لرزہ، تھرتھراہٹ، کپکپی، ایک بیماری جس سے خود بخود ہاتھ وغیرہ کانپتے ہیں۔ عرفی: رسمی، مشہور۔ رقیباں: رقیب کی جمع، محافظ، ہم پیشہ، حریف، ایک معشوق کے عاشقوں میں سے کوئی ایک، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام۔ ننگ: لحاظ، شرم، حیا، ذلت، بدنامی۔

اردو کی آخری کتاب

ماں کی مصیبت

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے اور پیار سے حسب ذیل باتیں پوچھتی ہے۔

۱۔ وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا۔

۲۔ بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔

۳۔ دولہا کب بنے گا اور دلہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

۴۔ ہم کب بڈھے ہوں گے؟

۵۔ تو کب کمائے گا؟

۶۔ آپ کب کھائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتا ہے اور کلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جب ننھا سا ہونٹ نکال کر باتی چہرے سے رونی صورت بناتا ہے تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے۔ سُلانا ہو تو افیم کھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے۔ (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے) جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے۔ کچی نیند میں رونے لگتا ہے تو بے چاری ماں مامتا کی ماری آگ جلا کر دودھ کو ایک اور اُبال دیتی ہے۔ صبح جب بچہ کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اُٹھ بیٹھتی ہے۔ اُس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے منہ دُھلاتی

ہے۔آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے اور جی کڑا کر کے کہتی ہے کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا ہے واہ واہ!

کھانا خود بخود پک رہا ہے

دیکھنا! بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہے۔ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔دھوئے دھائے برتن صندوق پر چنے ہیں۔تاکہ صندوقچہ کھل سکے ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔کسی میں دال ہے کسی میں آٹا۔کسی میں چوہے۔ پھکنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے تاکہ جب چاہے آگ جلا لے۔جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔آٹا گندھا رکھا ہے چاول پک چکے ہیں۔نیچے اتار کر رکھے ہیں دال چولہے پر چڑھی ہے۔غرض کہ سب کام ہو چکا ہے لیکن یہ پھر بھی پاس بیٹھی ہے۔میاں جب آتا ہے کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے۔پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔کتا چکتا ہے تو کھانا اٹھا لیتی ہے۔ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔کھانے پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا لے بیٹھی ہے۔کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے کیوں نہ ہو؟ مہاتما گاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں۔آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑے۔

دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے!

بڑی محنت کرتا ہے شام کو بھٹی چڑھاتا ہے۔دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے۔کبھی کبھی بیل پر لادی لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر۔تاکہ کپڑوں والے کبھی پکڑ نہ سکیں۔جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے۔گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے۔دوپہر ہونے کو آئی اب تک پانی میں کھڑا ہے۔اسے ضرور سرسام ہو جائے گا۔درخت کے نیچے بیل بندھا ہے۔جھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے۔دریا کے اس پار ایک گلہری دوڑ رہی ہے۔دھوبی انہیں سے اپنا جی بہلاتا ہے۔

دیکھنا دھوبن روٹی لائی ہے دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا ہے۔کپڑا پڑے پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔کتے نے بھی یہ دیکھ کر کان کھڑے کیے۔اب دھوبن گانا گائے گی۔دھوبی

دریا سے نکلے گا۔دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا۔

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب! کہاوت کی وجہ سے اور پھر یہ تو ہمارا چوکیدار ہے۔دیکھئے! امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں۔کیا مجال کوئی پاس تک آجائے جو لوگ ایک دفعہ کپڑے دے جائیں پھر واپس نہیں لے جاسکتے۔میاں دھوبی تمہارا کام بہت اچھا ہے۔میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو ننگا پھراتے ہو۔

☆☆☆

فرہنگ

کلنڈر (Calendar): جنتری، تقویم، نظام، فہرست، پترا۔افیم: افیون، مشہور زہریلی اور نشیلی چیز جو پوست کے رس کو منجمد کر کے بنائی جاتی ہے۔گندھا: آٹے میں پانی ڈال کر ملانا، گوندھنا آٹا وغیرہ۔رکابی: تھالی، طشتری، پلیٹ۔سرسام: ایک بیماری جس سے دماغ میں ورم آجاتا ہے۔پڑے: پڑا، پٹڑا، تختہ، چوکی، دھوبیوں کے کپڑے دھونے کا تختہ یا پتھر کی سل۔

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی۔اے بھی پاس کرلیا۔لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی' ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا۔یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارک باد دینے کے لیے آئے۔قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے' دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔جس کی نشوونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔اس لیے وظیفے کا نہ ملنا بھی خصوصاً ان رشتہ داروں کے لئے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے۔فخر و مباہات کا باعث بن گیا اور "مرکزی رشتہ داروں" نے تو اس کو پاس وضع اور حفظ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے حد سراہا۔بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی۔اس لیے بلاتکلف یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے ضروری ہے کہ ایسے ہونہار

طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس کے بارے میں ہم سے مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی۔ لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانب دار اور ایمان دار منصف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیسیں دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹوگرافی، تصنیف و تالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام، غرض کہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالا نشین پیشے سیکھے جا سکتے ہیں اور تھوڑے عرصے کے اندر انسان ہرفن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا۔ کیونکہ ولایت بھیجنے کے لیے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گردونواح میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا۔ اس لیے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب اِدھر اُدھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی اور بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سُلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شام کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیحد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا۔ جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضروری دی گئی۔ لیکن ایک مناسب حد تک تا کہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور

فطرت اپنا کام حسن وخوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیل دار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ صرف ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا۔ لیکن انہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان۔ اُس پر انہوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے اور جو طلباء باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری نگہداشت نہ کی جائے تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں یا کسی جوئے خانے میں ہزار ہا روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ یا فرسٹ ایئر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے۔ لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید مگر ہاسٹل مُضر۔ وہ بہت ٹھیک، مگر یہ ناممکن۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے۔ تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کیے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لیے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ میں ایک شیر خوار بچہ تھا۔ تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیلِ علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اُٹھ رہا تھا۔ وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا ہم روز بروز

مرجھاتے چلے گئے اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی۔ لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو۔ جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں۔ ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگرٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ سیر کو بھی چلے جاتے تھے۔ ہنس بول بھی لیتے تھے۔ لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی' ایک فراخی اور ایک وارفتگی ہونی چاہیے وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں۔ کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔ کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ممکن ہے' کس کمرے کا دروازہ باہر سے کھولا جا سکتا ہے۔ کون سا ملازم موافق ہے۔ کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کر لیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلباء کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا: والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں۔ لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا۔ ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا۔ ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں' میں وطن کو واپس گیا تو مختصر مگر جامع اور موثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار کر رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ

وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لیے ازحد مضر ہوتی ہے۔اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کیے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم وتشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔آنکھیں بند کر کے مظلوم اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بچارا ہوسٹل کو واپس آ رہا تھا۔چلتے چلتے پاؤں میں موچ آ گئی۔دو منٹ دیر سے پہنچا صرف دو منٹ۔بس صاحب اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا۔پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا اور مہینے بھر کے لیے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔توبہ ہے الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے۔ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔پھر ایک دن موقع پا کر بچارے محمود کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شامت اعمال بچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔بس اتنی ہی فضول خرچی پر اسے عمر بھر سینما جانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ان کے رویے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہیے تھا۔

انہی ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک آدھ نیا ڈھنگ اختیار کیا اور سال بھر تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی آ گئی تھی۔پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلیلیں ہم نے پیش کی تھیں وہ اب ہمیں نہایت بور معلوم ہونے لگی تھیں۔اب کے ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی۔چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی تو ذرا دقت

محسوس ہوئی' کالج کے جن طلبا کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں۔ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جاسکے۔ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔جانتا ہے کہ'' والدینی اغراض'' کے لیے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔بعض روشن خیال بیٹے والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کردیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے نام منی آرڈر پر منی آرڈر چلا آتا ہے۔

بناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار' ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تو ایک دن والد نے پوچھا:

''تمہارا شخصیت سے آخر مطلب کیا ہے۔''

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔میں نے کہا:'' دیکھئے نا! مثلاً ایک طالب علم ہے وہ کالج میں پڑھتا ہے۔اب ایک تو اس کا دماغ ہے۔ایک اس کا جسم ہے۔جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے۔جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے۔میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ دماغ سے۔ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو۔لیکن پھر بھی اس کی شخصیت ۔۔۔۔۔ نہ خیر دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہیے۔ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے۔لیکن پھر بھی اگر ہو بھی ۔۔۔۔۔ گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے۔ٹھہریے میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔

ایک منٹ کی بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔اس کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔مجھے شخصیت نہیں کہنا چاہیے۔شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے۔سیرت کے لفظ سے ٹپکتی ہے۔چنانچہ میں نے سیرت

کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔والد کہنے لگے ''کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟''

میں نے کہا ''چال چلن ہی کہہ لیجئے۔''

''تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا ''بس یہی تو میرا مطلب ہے۔''

''اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے؟''

میں نے نسبتاً نحیف آواز میں کہا ''جی ہاں''

''یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں۔سچ زیادہ بولتے ہیں نیک زیادہ ہوتے ہیں۔''

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا اے کاش! میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا؟

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں ''زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن'' گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔لیکن اگلے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں پہلے سے زیادہ شدومد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا۔نئی نئی مثالیں کام میں لاتا۔جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کیساتھ ملنے جلنے کے موقعے ملتے رہتے ہیں اور ان ''بیرون از کالج'' ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے۔اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بڑی اچھی ہوتی ہے۔صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔مکھیاں اور مچھر مارنے کے لیے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبا سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں۔اس سے رسوخ بڑھتا ہے۔لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میری تقریروں میں جوش بڑھتا اور معقولیت کم ہوتی

گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر گھر والے مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے ایک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگایئے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی ہرگز نہیں۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی۔اے کا امتحان دیا تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی ہوا تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی' بی۔اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا۔ لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلے جیسی وقعت نہ رہی تھی۔

میں زمانہ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک تو آپ میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی۔اے میں کیوں فیل ہوا۔ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف۔اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا۔ اس لیے ہم اس میں "کچھ" پاس ہی ہو گئے۔ بہرحال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا۔ لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو۔ (ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر کوئی اس میں سفر کر رہے ہوں۔ نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے)

اب جب ہم بی۔اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے یہ سوچا کہ بی۔اے میں

ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لیے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیا۔ لیکن جب پرنسپل نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہو گئے۔ چنانچہ بی۔اے میں ہمارے مضامین انگریزی' تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورت حالات پیدا ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔ ہماری قوت مطالعہ منتشر ہو گئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا وہ بانٹ کر ان تینوں مضامین کو دیتا۔ آپ یقین مانیے کہ اس سے بڑا فرق پڑ جاتا اور فرض کیا اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا۔ بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لیے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا۔ یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر کما حقہ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا لیکن بی۔اے میں ایک انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا۔ اب آپ ہی سوچیے نا! کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان میں صرف کرنا پڑا۔ وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا بلکہ اس کی بجائے۔۔۔ مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لیے از حد حیرت کا موجب ہوا اور سچ پوچھیے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی۔اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیے تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو' مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ

کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید و شاید۔ باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے۔ لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکا اپنے مطالعہ کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں لیکن جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم پہلے انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہیں۔

۱۔ انگریزی' تاریخ' فارسی

۲۔ انگریزی' تاریخ

۳۔ انگریزی' فارسی

۴۔ تاریخ' فارسی

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کر دیئے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا۔

۵۔ تاریخ میں فیل

۶۔ انگریزی میں فیل

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ از حد جانکاہ ہوگا۔ لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور

مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائے گا۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے اس سال فارسی میں فیل ہوں گے۔ پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بے تابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار دراصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لیے بی۔اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا تو والدین کو نتیجے کے لیے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں پرچوں پر کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اکثر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انہیں صدمہ نہ ہو۔ لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسرِ نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آ جایا کرتا تھا کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔ لیکن اِدھر اُدھر کے لوگ "اجی! نہیں صاحب" "اجی! کیا کہہ رہے ہو۔" "اجی! یہ بھی کوئی بات ہے۔" ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے بہرحال اب کے پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دل کو تسلی تھی کہ بس یہ آخری موقعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہیے۔ اب تو کالج میں صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے تو شاید اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال صرف ایک سال اور یہ آخری موقعہ ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ جن پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا۔ ان کے سامنے نہایت بے تکلفی

سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلباء کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرض داشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور و خوض میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہوا کہنے لگے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحرِ علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جابجا طلباء علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں، کامن روم میں، غسل خانوں میں، برآمدوں میں ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔ جن کو انگریزی ادب کا شوق ہے وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلباء اپنے ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلباء رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ۔۔۔۔۔۔۔

والد نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لیے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی۔ جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہو گی اور انہیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لیے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لیے ہاسٹل

میں آ رہے ہیں۔ جس سے ہم طلباء کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادر مہربان کی سی سوچ لی۔ جس کے اردگرد ناتجربہ کار طلباء مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے اور فلاں فلاں قواعد سے اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔ اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہو گئے۔

ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا۔ یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمایئے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

☆☆☆

فرہنگ

انٹرنس (Entrance): ابتداء، شروع، دروازہ۔ کوتاہ بینی: کم نظری، کم بینی، کوتاہ اندیشی، عاقبت ، نااندیشی۔ بہبود: بہتری، نفع، فائدہ، بھلائی۔ مضافات: مضاف کی جمع، اردگرد، قرب و جوار، اطراف، شہر کے آس پاس کے قصبے اور گاؤں۔ ممتحن: امتحان لینے والا، پڑتال کرنے والا، جانچنے والا، پرکھنے والا۔ نجابت: شرافت، عالی خاندان۔ چنداں: اس قدر، اتنی، ایسی۔ مجمل: مختصر، خلاصہ، اختصار۔ معصیت: گناہ، قصور، خطا، نافرمانی، انحراف۔ زعم: گمان، ظن، غرور۔ وارفتگی: آپے سے باہر ہونے کی حالت، بے خودی، بے خبری۔ پنپنے: سرسبز ہونے، تروتازہ ہونے، ترقی کرنے، بڑھنے، افلاس دور ہونے، کمزوری دور ہونے، پھلنے پھولنے۔ شدومد: شان و شوکت، دھوم دھام، زور و شور، طاقت۔ کماحقہ: بخوبی، ٹھیک ٹھاک، جیسا اس کا حق ہے۔ طبائع: طبیعت کی جمع، طبیعتیں۔ بایدوشاید: جیسا چاہے، جیسا لائق ہے، نہایت مناسب، درست۔ بہی خواہ: حساب مانگنے والا، قرض مانگنے والا۔ پیشین گوئی: پیش گوئی، کسی بات کی پہلے سے خبر دینا۔ رفاقت: ہمراہی، ساتھ، محبت، دوستی، اتحاد۔ مژدہ: خوش خبری، بشارت، مبارک باد۔

مرید پور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات ٹال دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہاں اس پر ایک مقدمہ بن گیا تھا اس کی وجہ سے روپوش ہے کوئی کہتا ہے وہاں کہیں ملازم تھا۔ غبن کا الزام لگا ہجرت کرتے ہی بنی۔ کوئی کہتا ہے والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں آج میں سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں۔ خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا یوں دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں۔ میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہ ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے اور میں تو اس کے نزدیک بس علم وفن کا ایک دیوتا ہوں۔ یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آ جاتا ہے۔ میں نے شائستہ سے شائستہ دودمانوں کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے دیکھا ہے کہ ان پر ہیچ ذات کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

ایک سال میں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں، میں موجود تھا وہیں کانگرس والوں نے بھی

اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ یہ اعلان کر چکا ہوں اور اب بھی ببانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تسکین نخوت کے لیے کانگرس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرالیا۔ لیکن یہ محض حاسدوں کی بدنیتی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے دو ایک مرتبہ بعض تھیٹروں کو بھی دعوت دی ہے لیکن کانگرس کے مقابلے میں میرا رویہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اس موضوع پر کچھ نہ کہوں گا۔

جب کانگرس کا سالانہ جلسہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا متقی ہو گا جو وہاں جانے سے گریز کرے۔ زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا۔ چنانچہ میں نے شغل بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سنی۔ دن بھر تو جلسے میں رہتا رات کو گھر آ کر اس دن کے مختصر سے حالات اپنے بھیجتے کو لکھ کر بھیجتا تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بے حد ادب و احترام کے ساتھ کھولتے۔ بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ وضو بھی کر لیتے۔ خط کر خود پڑھتے پھر دوستوں کو سناتے پھر اخباروں کے ایجنٹ کی دکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر دہراتے۔ پھر مقامی ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے جو اسے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا۔ اس اخبار کا نام ''مرید پور گزٹ'' ہے اس کی مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں۔ وہ مہینے تک جاری رہا پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب کا حلیہ حسب ذیل ہے۔

رنگ گندمی، گفتگو فلسفیانہ، شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں اور عنداللہ ماجور ہوں نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہو گی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل پر اپنا ایک کانگرس نمبر بھی نکال مارا۔ جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے ہیں۔ بہر حال مرید پور کے بچے بچے نے میری قابلیت' انشاء پردازی' صحیح الدماغی اور جوش قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھے مرید پور کا قومی

لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں جو وقتاً فوقتاً ''مرید پور گزٹ'' میں چھپتی رہیں۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے محض بے خبر تھا۔ سچ ہے خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس قدر گھر کر لیا ہے اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کیے بازار میں سے گزر جاتا ہے میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگرس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا۔ ''مرید پور گزٹ'' کا میں خریدار نہ تھا۔ بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے کبھی برسبیل تذکرہ اتنا بھی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ لیکن بہر حال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں۔

کچھ عرصے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جا بجا جلسے نکل آئے جس کسی کو ایک میز ایک کرسی اور ایک گلدان میسر آیا۔ اسی نے جلسے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مرید پور کی انجمن نوجوانان ہند کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔ ہر کہ دمہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کے لیے بے تاب ہے۔ مانا ملک بھر کو آپ کی ذات بابرکات کی از حد ضرورت ہے لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ:

خارِ وطن از سُنبل و ریحاں خوشتر

اسی طرح کی تین چار براہین قاطعہ کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آ کر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔

خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا تو رفتہ رفتہ باشندگانِ مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔

میں ایک کمزور انسان ہوں اور پھر لیڈری کا نشہ ایک لمحہ ہی میں چڑھ جاتا ہے۔ اس ایک لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا۔ اہل وطن کی بے حسی پر بڑا

ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا کہ ان بیچاروں کی بہبودی اور رہنمائی کا ذمہ دار تو ہی ہے۔ تجھے خدا نے تدبر کی قوت بخشی ہے۔ ہزار ہا انسان تیرے منتظر ہیں۔ اٹھ کہ سینکڑوں لوگ تیرے لیے ماحضر لیے بیٹھے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کر لی اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا۔ سٹیشن پر کوئی شخص نہ آئے ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کر دیا۔ طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح و شام پھرتے رہے۔

"ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں۔"

"ہندو اور مسلم شیر و شکر ہیں۔"

"ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیے۔ اے میرے دوستو! ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں۔"

"جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔ جنھوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں "سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے اک جا" والا واقعہ پڑھا تھا۔ اسے نکال کر نئے سرے سے پھر پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا پھر یاد آیا۔ کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑو۔ وہ توڑ نہیں سکتے پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کراتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا۔ تقریر کا آغاز سوچا تو کچھ اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی کہ:

پیارے ہم وطنو!

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے

فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
یہ چاروں طرف سے ندا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایہ ناز شاعر یعنی مولانا الطاف حسین حالیٰ پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلم بند کیے تھے۔اس کو کیا معلوم تھا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا۔اس کے یہ الم ناک الفاظ روز بروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔آج ہندوستان کی یہ حالت ہے۔۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک درد ناک نقشہ کھینچوں گا۔افلاس' غربت اور بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا اور پھر پوچھوں گا کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا۔جو لوگ اکثر بیان کرتے ہیں مثلاً غیر ملکی حکومت' آب و ہوا اور مغربی تہذیب۔لیکن ان سب کو باری باری غلط قرار دوں گا اور پھر اصلی وجہ بتاؤں گا کہ اصلی وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔آخر میں اتحاد کی نصیحت کروں گا اور تقریر کو اس شعر پر ختم کروں گا کہ:

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اچھی طرح غور کر لینے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنا لیا اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا۔تاکہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا۔

۱۔ تمہید۔اشعار حالی (بلند اور درد ناک آواز سے پڑھو)

۲۔ ہندوستان کی موجودہ حالت

(الف) افلاس

(ب) بغض

(ج)　قومی رہنماؤں کی خود غرضی

۳۔　اس کی وجہ

کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں

کیا آب و ہوا ہے؟ نہیں

کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں

تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ جس کے دوران میں مسکراتے ہوئے تمام حاضرین جلسہ پر ایک نظر ڈالو)

۴۔　پھر بتاؤ کہ وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ (نعروں کے لیے وقفہ) اس کا نقشہ کھینچو۔ فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو۔

(اس کے بعد شاید چند نعرے بلند ہوں ان کے لیے ذرا ٹھہر جاؤ)

۵۔　خاتمہ۔ عام نصائح۔ خصوصاً اتحاد کی تلقین (شعر)

(اس کے بعد انکسار کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو۔)

اس خاکے کو تیار کر چکنے کے بعد۔ جلسے کے دن تک ہر روز اس پر ایک نظر ڈالتا رہا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بعض معرکتہ آراء فقروں کی مشق کرتا رہا۔ نمبر تین کے بعد کی مسکراہٹ کی خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تاکہ تقریر کے دوران میں آواز سب طرف پہنچ سکے اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سن لیں۔

مرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ راستے میں سانگا کے سٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ انجمن نوجوانان ہند کے بعض جوشیلے ارکان وہاں استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہار پہنائے اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیئے۔ سانگا سے مرید پور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی مسائل پر بحث کرتا رہا۔ جب گاڑی مرید پور پہنچی تو سٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر تھے انہوں نے کہا "سر باہر نکالیئے لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہار میرے گلے میں تھے ایک

سنگترہ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھا تو لوگ اور بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر پر مجھے سوار کرایا گیا اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف چلا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو ہجوم پانچ چھ ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ جو یک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگا تا رہا تھا۔ دائیں بائیں سرخ سرخ جھنڈوں پر مجھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے۔ مثلاً ہندوستان کی نجات تمہیں سے ہے۔ ''مرید پور کے فرزند خوش آمدید۔'' ''ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔''

مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ صدر جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے بغل گیر ہو کر میری پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی۔

''حضرات! ہندوستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔۔۔۔۔''

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو نوٹ ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یک لخت ایک خفیف سی خنکی محسوس ہوئی۔ دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو' ابھی اور کئی جیبیں ہیں۔ گھبراؤ نہیں رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں۔ لیکن وہ کاغذ کہیں نہ ملا۔ تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا۔ دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا۔ ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے' دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ٹٹولا لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔ صدر جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے۔

''مرید پور کا شہر ان پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات نوع انسان کے لیے۔۔۔۔۔''

خدایا! اب میں کیا کروں؟ ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے۔ نہیں' اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔ نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہو گا۔ جاہل کہنا چاہیے یہ بھی ٹھیک نہیں غیر مہذب۔

''۔۔۔۔۔ ان کی اعلیٰ سیاست دانی۔ ان کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون

واقف نہیں۔ یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں۔ لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے۔۔۔۔۔"

ہاں وہ تقریر کا ہے سے شروع ہوتی ہے؟ ہندو مسلم اتحاد پر تقریر' چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں۔ لیکن وہ تو آخر میں ہیں۔ وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا؟

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے دل ہلا دیں گے اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے۔۔۔۔۔"

صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی۔ اتنے میں صدر نے مجھ سے کہا۔ مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیئے۔ اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے اور مجھے نشست پر سے اٹھنا ہے۔ چنانچہ میں ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر تھا۔ کچھ لڑکھڑایا لیکن پھر سنبھل گیا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ہال میں ایک شور تھا۔ میں بیہوشی سے ذرا ہی ورے تھا اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھیں جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں۔ تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خودغرضی بھی ضرور بیان کرنی ہے اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تھی بگلے اور لومڑی کی کہانی۔ نہیں ٹھیک ہے دو بیل۔۔۔۔۔"

اتنے میں ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سہارے کے لیے میز کو پکڑ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میز بھاگنے کو ہے اور میں اسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی۔ گلا خشک تھا بصد مشکل میں نے یہ کہا کہ:

"پیارے ہم وطنو!"

آواز خلاف توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ ایک دو شخص ہنس دیئے۔ میں نے گلے کو صاف کیا تو اور کچھ لوگ ہنس پڑے۔ میں نے جی کڑا کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔ پھیپھڑوں پر یک لخت جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی۔ اس پر بہت سے لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی تو میں نے کہا۔

"پیارے ہم وطنو!"

اس کے بعد ذرا دم لیا اور پھر کہا۔

"پیارے ہم وطنو!"

کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔بیسیوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں۔لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔

"پیارے ہم وطنو!"

اب کے لوگوں کی ہنسی سے میں بھنا گیا۔اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا۔ارادہ کیا کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا۔ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں تو پھر کوئی مشکل نہ رہے گی۔

"پیارے ہم وطنو!

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب وہوا خراب یعنی ایسی ہے کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں.........سمجھے آپ؟(وقفہ.....) نقص ہیں۔لیکن یہ بات یعنی امر جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔گویا چنداں صحیح نہیں۔" (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے۔سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا۔یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔

"ہاں تو بات دراصل یہ ہے کہ ایک جگہ دو بیل اکٹھے رہتے تھے جو باوجود آب وہوا اور غیر ملکی حکومت کے۔" (زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا کہ کلام کچھ بے ربط سا ہو رہا ہے۔میں نے کہا' چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

"مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجیے۔لکڑیاں اکثر مہنگی ملتی ہیں وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہے۔گویا چونکہ اکثر لوگ غریب ہیں۔اس لیے گویا لکڑیاں کا گٹھا یعنی آپ دیکھیے نا! کہ اگر۔"

(بلند اور طویل قہقہہ)

"حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی۔نحوست منڈلا رہی ہے۔" (قہقہے اور شوروغوغا.....اسے باہر نکالو۔ہم نہیں سنتے)

شیخ سعدی نے کہا ہے کہ

چواز قومے یکے بے دانشی کرد

(آواز آئی کیا بکتا ہے) خیر اس بات کو جانے دیجئے۔ بہر حال اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ:

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس شعر نے دوران خون کو تیز کر دیا۔ ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا۔

"جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی زندگیاں لوگوں کے لیے شاہراہ ہیں اور ان کی حکومتیں چار دانگ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں۔ (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی) آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ زندگی کے وہ تمام شعبے۔۔۔۔۔"

لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہجوم میں سے کسی شخص نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح ہمت کر کے سگرٹ کی ایک خالی ڈبیا مجھ پر پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے اردگرد سٹیج پر آ گریں۔ لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

"حضرات! تم یاد رکھو تم تباہ ہو جاؤ گے۔"

"تم دو بیل ہو۔۔۔۔۔"

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی۔ اسٹیج سے پھلانگا اور زقند بھر کے دروازے میں سے باہر کا رخ کیا۔ ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا بلکہ سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان کو سن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی اور سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا۔ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں بے تحاشا اس میں گھس

گیا۔ایک لمحے کے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی۔

اس دن کے بعد آج تک نہ مرید پور نے مجھے مدعو کیا نہ مجھے خود وہاں جانے کی کبھی خواہش پیدا ہوئی ہے۔

☆☆☆

فرہنگ

بانگ دہل: نقارے کی چوٹ پر، الاعلان۔ نخوت: گھمنڈ، غرور، خود بینی، تکبر۔ لال بجھکڑ: پرلے درجے کا بے وقوف، وہ احمق جسے اپنی عقل پر بڑا گھمنڈ ہو۔ سنبل: ایک قسم کی خوشبودار گھاس۔ ریحان: ایک خوشبو دار پودا، نیاز بو۔ قاطعہ: قاطع، قطع کرنے والا، کاٹنے والا۔ نصف النہار: دوپہر کا وقت، دن کا نصف۔ فلاکت: غریبی، مفلسی، ناداری، نحوست۔ عندلیب: بلبل، گل دم۔ نصائح: نصیحت کی جمع، نصیحتیں، پند، نیک مشورے۔ ورے: ادھر، اس طرف، میری طرف۔ منحنی: جھکا ہوا، خمیدہ، ٹیڑھا، دبلا، لاغر، کمزور، نحیف۔ بھنا گیا: غصے میں آ گیا، جل بھون گیا۔ قومے: قومہ، نماز میں رکوع کے بعد کھڑا ہونا۔ چار دانگ عالم: ہر طرف، پوری دنیا میں۔ زقند: جست، چھلانگ۔

لاہور کا جغرافیہ

تمہید

تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے۔اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔۔یہ کہنے کی بھی اب ضرورت نہیں کہ کرے کو دائیں سے بائیں گھمایئے حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آکر ٹھہر جائے۔پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقام انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجئے۔جہاں تمام کرّے پر مرقوم ہو وہی لاہور کا محل وقوع ہے۔اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں لوگ بیان کرتے ہیں کہ لاہور لاہور ہی ہے۔مگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محل وقوع

ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے۔وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔۔ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں۔ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا ہے۔بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے اس لیے اب یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یوپی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے تھے۔اول الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی اور غوری تخلص کرتے ہیں۔موخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں۔یہ بھی تخلص کرتے ہیں۔۔۔۔۔اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

حدود اربعہ

کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا۔لیکن طلباء کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔یوں سمجھئے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے۔گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا

لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت ہے۔اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ مفاد عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں۔بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے

گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیئے ہیں۔ جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب و ہوا کے لیے ایک سکیم عرصے سے کمیٹی کے زیر غور ہے۔ یہ سکیم نظام سقّے کے وقت سے چلی آتی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقّے کے وقت سے چلی آتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقّے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں اور باقی جو ہیں ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آ رہی ہے۔ اس لیے ممکن ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتیٰ الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی جو رائے دہندگی کے موقعہ پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقّے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جابجا نل لگوا دیئے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گے۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں۔ تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت

جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہاں کے ذرائع آمد و رفت کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہیں۔ تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کماحقہ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے۔ تاریخی اعتبار

سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردوبدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں۔ جنہوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو ہک لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانگ دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر انہی کا گوشت بکتا ہے اور زینیں کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل وصورت میں دم دار تارے سے ملتا ہے کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دم کو دبا لیتا ہے اور اس ضبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ سڑک کا ہر تاریک گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے۔

قابل دید مقامات

لاہور میں قابلِ دید مقامات مشکل سے ہی ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں۔ مثلاً ''اہل لاہور مژدہ'' یا ''اچھا اور سستا مال'' اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً گریجویٹ درزی

ہاؤس یا سٹوڈنٹوں کے لیے نادر موقع یا" کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا۔" رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے۔ بائیں طرف حافظ کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدام ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بوضاحت بیان کر دیئے گئے ہیں۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوا رکھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی ابتلا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے۔ اس لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لحہ بدلتی رہتی ہے اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے وقت وہاں اہالیان لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بحروف جلی "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے جہاں "بجلی پانی کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے۔ وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی صاحب تاج کا مکان ہے۔ "کرشنا بیوٹی کریم" شالامار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت

اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے اہم صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبر والے ہیں

مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہےاور فن تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔پریزیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں۔چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔سہ پہر کو کسی سنیما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے۔تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آسکتی ہے چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار

لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلباء ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہےاور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلباء کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔قسم اول جمالی کہلاتی ہے یہ طلباء عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں اور اس عمل کے بعد کسی رستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔غروب آفتاب کے بعد کسی سنیما یا سنیما کے گردونواح میں:

رُخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

شمعیں کئی ہوتی ہیں لیکن سب کی تصویر ایک البم میں جمع کرکے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خطوط لکھتے رہتے ہیں۔دوسری قسم جلالی طلباء کی ہے۔ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے۔اس لیے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لئے نکلتے ہیں اور جود و سخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔کالج کی خوراک انہیں راس نہیں آتی۔اس لیے ہوسٹل میں فروکش نہیں

ہوتے۔تیسری قسم خیالی طلباء کی ہے یہ اکثر روپ اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر باآواز بلند تبادلہ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں اور آفرنیش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔اس لیے علی الصباح پانچ چھ ڈنٹر پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔گاتے ضرور ہیں لیکن اکثر بے سُرے ہوتے ہیں۔چوتھی قسم خالی طلباء کی ہے یہ طلباء کی خالص ترین قسم ہے۔ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔کتابیں' امتحانات' مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے۔اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبہ کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے۔لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لیے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت میں ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی انا کے ساتھ زنانے ڈبے میں سفر کر سکتے ہیں۔ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کیے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات

لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

1۔ لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔
2۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لیے سزا بھی تجویز کرو۔
3۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو؟

☆☆☆

فرہنگ

کرے: قدیم اردو میں کے کو کہتے ہیں۔ مرقوم: لکھا ہوا، لکھا گیا۔ فاتر: کمزور، ضعیف، سست۔ اول الذکر: جس کا ذکر سب سے پہلے کیا جاتا ہے۔ موخر الذکر: جس کا ذکر سب سے آخر میں کیا جاتا ہے۔ ید طولیٰ: بڑا لمبا ہاتھ، مہارت کمال، اچھی دسترس، کمال ہنر مندی۔ میونسپلٹی (Municipality): بلدیہ، شہری لوگوں کی جماعت جو شہر میں صفائی، پانی، روشنی وغیرہ کا انتظام کرتی ہے۔ ہوم رول (Home Rule): حکومت خود اختیاری۔ مسودات: مسودہ کی جمع، وہ تحریر جو سرسری طور پر لکھی جائے، وہ تحریر جو بطورِ خاکہ لکھی گئی ہو۔ کما حقہ: بخوبی، ٹھیک ٹھاک، جیسا اس کا حق ہے۔ ذبازت: گندگی، گندا پن، موٹائی، حجم۔ محاسن: حسن کی جمع، اچھائیاں، خوبیاں، بھلائیاں، نیکیاں۔ جلی: روشن، واضح، ظاہر، موٹا لکھا ہوا۔ مطمحِ نظر: مرکزِ نگاہ، مقصد اصلی۔ دساور: غیر ملک یا غیر ممالک، غیر ملک کی منڈی، سوداگری کا مال جو غیر ملک سے آئے۔ اواخر: آخر کی جمع، انتہا، حد، ختم، انجام۔ آواگون: آنا، جانا، آمدورفت، ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق بار بار مرنے اور جنم لینے کا سلسلہ، تناسخ۔ آفرینش: پیدائش، مخلوق، دنیا۔ خرخشے: خرشہ، جھگڑا، بکھیڑا، پریشانی، فضول بحث۔

سینما کا عشق

"سینما کا عشق عنوان تو عجب ہوس خیز ہے لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی تمام توقعات مجروح ہوں گی۔ کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں یا سینما کی موسیقی اور تاریکی میں جو ارمان انگیزی ہے۔ میں اس کا قائل نہیں میں تو سینما کے معاملے میں اوائل عمر ہی سے بزرگوں کا مورد عتاب رہ چکا ہوں۔ لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کی طفیل سینما گویا میری ایک دکھتی ہوئی رگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اس کا نام سنتا ہوں۔ بعض درد انگیز واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ میری فطرت ہی کج بیں بن گئی ہے۔

اول تو خدا کے فضل سے ہم سینما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے۔ اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو ہمارا دوست ہیں۔ لیکن خدا شاہد ہے ان کی دوستی سے جو جو نقصان ہمیں پہنچے ہیں کسی دشمن کے قبضہ قدرت سے بھی باہر ہوں گے۔

جب سینما کا ارادہ ہو ہفتہ بھر پہلے سے انہیں کہہ رکھتا ہوں کہ کیوں بھئی! مرزا صاحب اگلی جمعرات سینما چلو گے نا! میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے کام میں ہرج واقع نہ ہو لیکن وہ جواب میں عجب قدر ناشناسی سے فرماتے ہیں۔

"ارے بھئی! چلیں گے کیوں نہیں، کیا ہم انسان نہیں۔ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی اور پھر کبھی ہم نے تم سے آج تک ایسی بے مروتی بھی برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو؟"

ان کی تقریر سن کر میں کھسیانا سا ہو جاتا ہوں کچھ دیر چپ رہتا ہوں اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں۔

"بھئی! اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے ٹھیک ہے نا؟"

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے۔ خیر میں بھی بہت زور نہیں دیتا۔ صرف ان کو بات سمجھانے کے لیے اتنا کہہ دیتا ہوں۔

"کیوں بھئی سینما آج کل چھ بجے شروع ہوتا ہے نا؟"

مرزا صاحب عجب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں۔ "بھئی! یہ ہمیں معلوم نہیں۔"

"..را خیال ہے چھ ہی بجے شروع ہوتا ہے۔"

"اب تمہارے خیال کی کوئی سند نہیں۔"

"نہیں مجھے یقین ہے چھ بجے شروع ہوتا ہے۔"

"تمہیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟"

اس کے بعد آپ ہی کہیے میں کیا بولوں؟

خیر جناب! جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان کو روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس خیال سے کہ جلدی جلدی انہیں تیار کرا کے وقت پر پہنچ جائیں۔ دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ زنانے کے سب کمروں میں گھوم جاتا ہوں ہر کھڑکی میں سے جھانکتا ہوں۔ ہر شگاف میں سے آوازیں دیتا ہوں۔ لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تنگ آ کر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں وہاں دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ پنسل سے بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتا ہوں۔ پھر سگرٹ سلگا لیتا ہوں اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر ادھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آ جاتا ہوں اور اخبار

پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہر کام کے بعد مرزا صاحب کو ایک آواز دے لیتا ہوں اس امید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں۔ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں یا نہا رہے تھے تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں۔ لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں میں سے گونج کر واپس آ جاتی ہے۔ آخر کار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں لا کر متانت اور اخلاق کو بڑی مشکل سے مدنظر رکھ کر پوچھتا ہوں۔

''کیوں حضرت آپ اندر ہی تھے؟''

''ہاں! اندر ہی تھا۔''

''میری آواز آپ نے نہیں سنی؟''

''اچھا یہ تم تھے؟ میں سمجھا کوئی اور ہے۔''

آنکھیں بند کر کے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں اور دانت پیس کر غصے کو پی جاتا ہوں اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں۔

''تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟''

''وہ کہاں؟''

''ارے بندہ! خدا آج سینما نہیں جانا؟''

''ہاں سینما' سینما (یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) ٹھیک ہے سینما' میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے جو مجھے یاد نہیں آتی۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔ ورنہ مجھے رات بھر الجھن رہتی۔

''تو چلو پھر اب چلیں۔''

''ہاں وہ تو چلیں گے ہی میں سوچ رہا تھا۔ آج ذرا کپڑے بدل لیتے۔ خدا جانے دھوبی کم بخت کپڑے لایا ہے یا نہیں۔ یاران دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔''

اگر قتل انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا لیکن کیا کروں اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں۔ بے بس ہوتا ہوں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ:

''مرزا بھئی! اللہ مجھ پر رحم کرو۔ میں سینما چلنے کو آیا ہوں۔ دھوبیوں کا انتظام کرنے

نہیں آیا۔ یار بڑے بدتمیز ہو پونے چھ بج چکے ہیں اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔"

مرزا صاحب عجب مربیانہ تبسم کے ساتھ کرسی پر سے اٹھتے ہیں۔ گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی تمہاری طفلانہ خواہشات آخر ہم پوری کر ہی دیں۔ چنانچہ پھر یہ کہہ کر اندر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار ہوتا تو قانون کی رو سے انہیں کبھی کپڑے اتارنے ہی نہ دیتا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے پر پہنچ کر مڑ کے جو دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب۔ پھر اندر آ جاتا ہوں۔ مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کرید کر رہے ہوتے ہیں۔

"ارے بھئی چلو!"

"چل تو رہا ہوں یار۔ آخر اتنی بھی کیا آفت ہے؟"

"اور یہ تم کر کیا کر رہے ہو؟"

"پان کے لیے ذرا تمباکو لے رہا تھا۔"

تمام رستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے جاتے ہیں۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں وہ ساتھ آ ملتے ہیں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر آگے نکل جاتا ہوں پھر ٹھہر جاتا ہوں۔ غرضیکہ گو چلتا دگنی تگنی رفتار سے ہوں لیکن پہنچتا ان کے ساتھ ہی ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھپ۔ بہتیرا آنکھیں جھپکتا ہوں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اِدھر سے کوئی آواز دیتا ہے۔ "یہ دروازہ بند کر دو جی" یا اللہ! اب جاؤں کہاں۔ رستہ، کرسی، دیوار، آدمی کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ایک قدم بڑھاتا ہوں تو سر ان بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لیے دیوار پر لگی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جہاں ذرا تاریک تر سا دھبہ دکھائی دے جائے۔ وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہوگی۔ خمیدہ پشت ہو کر اس کا رخ کرتا ہوں اس کے پاؤں کو پھاند، اس کے ٹخنوں کو ٹھکرا، خواتین کے گھٹنوں سے دامن بچا، آخرکار کسی کی گود میں جا

بیٹھتا ہوں۔ وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں۔ مرزا صاحب سے کہتا ہوں "میں نہ بکتا تھا کہ جلدی چلو۔ خواہ مخواہ میں ہم کو رسوا کروایا نا گدھا کہیں کا۔" اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو حضرت بیٹھے ہیں اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب تماشے کی طرف متوجہ ہوتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ فلم کونسا ہے۔ اس کی کہانی کیا ہے اور کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں۔ ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے تو معاملہ کھلے کہ اتنے میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک وسیع و فراخ انگڑائی لیتے ہیں۔ جس کے دوران کم از کم دو تین سوفٹ فلم گزر جاتا ہے۔ جب انگڑائی کو لپیٹ لیتے ہیں تو سر کھجانا شروع کر دیتے ہیں اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے۔ بلکہ بازو کو ویسے ہی خمیدہ رکھے رہتے ہیں۔ میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے چائے دانی کے اس دستے کے بیچ میں سے اپنی نظر کے لیے رستہ نکال لیتا ہوں اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے میں ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد انہیں کرسی کی نشست پر کوئی مچھر یا پسو محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دائیں طرف ذرا اونچے ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں۔ میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں ایک لمحے کے بعد وہی مچھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں پھر سے پینترا بدل لیتے ہیں۔ غرضیکہ یہ دل لگی یونہی جاری رہتی ہے۔ وہ دائیں تو میں بائیں۔ وہ بائیں تو میں دائیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں کہ لے بیٹا! دیکھوں تو اب تو کیسے فلم دیکھتا ہے۔

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ہے "یار! تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم تو دیکھنے دو۔"

اس کے بعد میں غصے میں آ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور قتل عمد، خودکشی، زہر خورانی وغیرہ معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں۔ دل میں کہتا ہوں ایسی کی تیسی اس فلم کی۔ سو سو قسمیں

کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں۔ اگر آیا بھی تو اس کم بخت مرزا سے ذکر تک نہ کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے سے آجاؤں گا اوپر کے درجے میں سب سے اگلے قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نشست پر اُچھلتا کودتا رہوں گا۔ بہت بڑے طرے والی پگڑی پہن کر آؤں گا اپنے اوور کوٹ کو دو چھتریوں پر پھیلا کر لٹکا دوں گا۔ بہرحال مرزا کے پاس تک نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اس کم بخت دل کو کیا کروں۔ اگلے ہفتے پھر کسی اچھے فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے ہاں جاتا ہوں اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے کہ ''کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟''

☆☆☆

فرہنگ

مجروح: زخمی، گھائل، چوٹ کھایا ہوا۔ مقصود: قصد کیا گیا، ارادہ کیا گیا، (مجازاً) مطلب، مراد، عرض، مدّعا۔ مورد: اُترنے، پہنچنے، آنے ٹھہرنے کی جگہ، تالاب، جوہڑ۔ کج: خمیدہ، ٹیڑھا، ترچھا، آڑا۔ بلاٹنگ پیپر (Blotting paper)۔ للہ: خدا کے لئے، خدا کے واسطے، سیاہی چوس، جاذب۔ مربیانہ تبسم: شفقت بھری مسکراہٹ۔ نچلا: آرام سے، سکون سے، شرارتوں سے منع کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ قتل عمد: دیدہ دانستہ ہلاک کرنا، جان بوجھ کر مار ڈالنا۔

میں ایک میاں ہوں

مَیں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آراء کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آراء کو بُرے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعث ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجیے اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے۔ گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں۔ انہی سے جی بہلاتے ہیں ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا

جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔لیکن بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے۔ہمارے گھر میں ''موئے کبوتر باز'' کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل' کوے' گدھ' شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آراء کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔بیچ میں میری جانب گریز۔کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مُصمّم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔آخر گھر سب سے مقدم ہے میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے۔دروازہ کھٹکھٹایا کہنے لگے اندر آ جاؤ ہم نے کہا نہیں آتے تم باہر آؤ خیر اندر گیا۔بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لیے دھوپ میں بیٹھے تھے کہنے لگے بیٹھ جاؤ۔ہم نے کہا بیٹھیں گے نہیں آخر بیٹھ گئے معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے مرزا بولے کیوں بھئی خیر باشد! مَیں نے کہا کچھ نہیں کہنے لگے اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا اس لیے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں آخر ہم نے کہا۔

''مرزا بھئی! کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟''

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔اس دن تو ہم یونہی چلے آئے لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی ہم نے کہا چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر

دی ہے۔ کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر میں ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا اثر ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا۔ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پر اسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا اور پھر گانے لگے کہ ''توری چھل بل ہے نیاری۔۔۔۔۔'' اس کو ہماری انتہائی بد مذاقی سمجھا گیا اور اس بد مذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آراء نے مجھ سے میکے جانے کے لیے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے روشن آراء صرف دو دفعہ میکے گئی ہے اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے چلی جاؤں؟ میں نے کہا اور کیا؟

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کیے۔ یعنی اب بیشک دوست آئیں بیشک اودھم مچائیں۔ میں بیشک کھاؤں بیشک جب چاہوں اٹھوں۔ بیشک تھیٹر جاؤں میں نے کہا۔

''روشن آراء جلدی کرو نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔''

ساتھ اسٹیشن پر گیا جب گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی خط ضرور لکھتے رہیے گا۔''
میں نے کہا ہر روز اور تم بھی۔''

''کھانا وقت پر کھا لیا کیجیے اور وہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔''

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے میرا دل بھی بیتاب ہونے لگا اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ایک اخبار خریداتہ کر کے جیب میں ڈالا اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔اب جہاں چاہوں جاؤں۔چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گویا وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔سگرٹ سلگا لیا ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا۔تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا باہر ہی سے نوکر کو آواز دی۔

"امجد"

"حضور"

"دیکھو! حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا"

"گیارہ بجے سن لیا نا!؟ کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچے۔آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔اندر داخل ہوا تو سنسان۔آدمی کا نشان تک نہیں سب کمرے دیکھ ڈالے۔بلیرڈ کا کمرہ خالی' شطرنج کا کمرہ

خالی، تاش کا کمرہ خالی صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا ''کیوں بے آج کوئی نہیں آیا۔''

کہنے لگا ''حضور آپ جانتے ہیں اس وقت بھلا کون آتا ہے؟''

بہت مایوس ہوا باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا دیکھ کر بہت حیران ہوئے میں نے سب حال بیان کیا کہنے لگے۔

''تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں شام کا پروگرام کیا ہے؟''

میں نے کہا ''تھیٹر!''

کہنے لگے ''بس بہت ٹھیک ہے تم باہر بیٹھو میں ابھی آیا۔''

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا کہ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پہ جمائی۔ جمائی پہ جمائی۔ حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا ''اے یار! اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا۔ مردود کہیں کا سارا دن میرا ضائع کر دیا۔''

وہاں سے اُٹھ کر مرزا کے گھر گئے شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لیے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ

بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگرٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا کہنے لگا ''حضور حجام آیا ہے۔''

ہم نے کہا ''یہیں بلا لاؤ'' یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوالیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لئے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی۔ جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے کیا خیال دل میں آیا وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سردئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر آیا۔ باہر نکالا ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا دل بھر آیا۔ گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بے تاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نامعلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر رہا نہ گیا باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اداس ہوں تم فوراً آجاؤ۔

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آراء جس قدر جلدی ہو سکے گا آجائے گی اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس لیے تجویز ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا۔ بہت معقول طریقے سے قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی

شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اڑا نہیں اور ساتھ ہی قہقہے اڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے۔ کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے۔ کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے دوسرا وزیر تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔ سب نے کہا "واہ واہ! کیا بات کہی ہے۔" ایک بولا "پھر آج جو چور بنا اس کی شامت آ جائے گی۔" دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل ہے۔ سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے۔"

کھیل شروع ہوا بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں کوئی کہے "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائے؟" کوئی کہے نہیں "حضور سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔" دوسرے نے کہا "نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔" آخر میں بادشاہ سلامت بولے "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔" سب نے کہا "کیا دماغ پایا ہے حضور نے کیا سزا تجویز کی ہے۔ واہ واہ!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا "تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آ جائے گی۔" نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بے ہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شان استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیئے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقعہ اٹھا تو روشن آراء۔

دم خشک ہو گیا بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آراء جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ تم فوراً آ جاؤ۔ میں بہت اداس ہوں اور اپنی یہ

حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آ رہا ہے۔

روح منجمد ہو گئی اور تمام حواس نے جواب دیا۔ روشن آراء کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی۔۔۔۔۔ لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بے ہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذات خود از حد شریف واقع ہوا ہوں، جہاں تک میں ہوں۔ مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے۔ اس لیے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا۔ سوائے ڈاکیے یا حجام کے اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

''خط ہے؟''

''جی ہاں''

''دے جاؤ۔ چلے جاؤ۔''

''ناخن تراش دو۔''

''بھاگ جاؤ!''

بس اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا آپ دیکھئے تو سہی!

☆☆☆

فرہنگ

مسحور: جس پر سحر کیا گیا ہو، جس پر جادو کیا جائے۔ قبیحہ: بُری، معیوب۔ تڑکے: تڑکا، صبح، فجر، سویرا، علی الصباح۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے بر سبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجئے۔

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی انہوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالم خواب ہے ابھی سے کیا فکر۔ جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے لیکن یہ گولہ باری لحہ بہ لحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں۔ صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگا تار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباؤاجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہو گی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔"اچھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اچھا!۔۔۔۔۔۔۔۔ تھینک یو!۔۔۔۔۔۔ جاگ گیا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔ بہت اچھا! نوازش ہے!" آپ جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا! کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا۔ نہیں تو چھوڑ دیا کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے۔ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے۔ پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے اس کا اندازہ

کچھ اہل ذوق ہی لگا سکتے ہیں آخر کار جب لمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا آج پتہ چلائیں گے یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبحِ کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی ''لالہ جی۔۔۔۔۔ لالہ جی۔''

جواب آیا ''ہوں''

میں نے کہا ''آج یہ کیا بات ہے کچھ اندھیرا سا ہے؟''

کہنے لگے ''تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟''

تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا ''کیا کہا تم نے' تین بجے ہیں؟''

کہنے لگے ''تین۔۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔۔ کچھ سات۔۔۔۔۔۔ ساڑھے سات۔۔۔۔منٹ اوپر تین ہیں۔''

میں نے کہا ''ارے کم بخت' خدائی فوجدار' بدتمیز کہیں کے' میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے۔ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو اس وقت دادا جان کے منظور نظر نہ ہوتے۔ ابے احمق کہیں کے تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ امیر زادے ہیں کوئی مذاق ہے؟ لاحول ولاقوۃ۔''

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد و شدد کو خیر باد کہہ دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے۔ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے۔ بارہ بجے منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے۔ جوشِ شباب تو ہے ہی اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر!"

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے بس انگلیاں وہیں پر رُک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہو "یہ آپ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر)۔

میں نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں لیکن فرمایئے۔"

بولے "ذرا۔۔۔ وہ میں۔۔۔ میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔"

بس صاحب ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مر گئی۔ دل نے کہا "او نابکار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔" صاحب خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا! ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔"

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آبیٹھے۔ دانت بھینچ لیے نکٹائی کھول دی۔ آستینیں چڑھالیں لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ' سبز' زرد' سبھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر پندرہ اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانسو جواب آیا لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین ہی بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے۔ لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا تو لغویات ہے۔ البتہ پانچ' چھ' سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت

بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی، باقاعدہ ہو گی ہم خرما و ہم ثواب۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہیے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے۔ بستر میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں؟ یوں ہماری اپنی قوت ارادی کافی زبردست ہے۔ جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی "لالہ جی!"

انہوں نے پتھر کھینچ مارا "ہلس!"

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ "لالہ جی صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں کل اگر ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت چھ بجیں۔۔۔۔۔۔؟" جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا "جب چھ بج چکیں تو۔۔۔۔۔۔سنا آپ نے؟" چپ۔

"لالہ جی"

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا "سن لیا چھ بجے جگا دوں گا۔ تھری گاما پلس فورا یلفا پلس۔۔۔۔۔"

ہم نے کہا "ب ب ب بہت اچھا یہ بات ہے۔"

توبہ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی بہت شریف آدمی ہیں اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انہوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا۔ ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لے تو بس جاگتے ہیں وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا میں نے ان کا شکریہ ادا کیا انہوں نے اسے اس شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہر حال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا

ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ لی۔ پھر کا پتہ نہیں شاید لحاف اوپر سے اتار دیا شاید سر اس میں لپیٹ دیا یا شاید کھانسا کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے' پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں کیا پتہ۔ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔ مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو' حد درجے کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزاء وقت بہت اچھی طرح صرف کیا۔ ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا ' لالہ جی! صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے۔ جو پڑھو خدا کی قسم! فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی! خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے۔ یعنی اگر صبح کی بجائے صبح' صبح شام ہوا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹتا۔''

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے۔

''تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا!''

میں نے کہا'' ہاں ہاں! واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ بے شک۔''

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعہ کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جوڑ لیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب سرکا لیا۔ اوور کوٹ اور گلو بند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے۔ دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے

ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو ''گڈ مارننگ'' کیا اور نہایت بیدردانہ لہجے میں کھانسا۔لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے۔دل سے کہا کہ ''دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔'' دل نے کہا ''اور کیا؟ تمہارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔'' ہم نے کہا ''سچ کہتے ہو یار! یعنی اگر ہم سُستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔بھئی! کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔'' ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے۔''خوب! تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔آخر مذہب سب سے مقدم ہے ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا خوف۔سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔اکبر بیچارا یہی کہتا کہتا مر گیا۔لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی۔۔۔۔۔'' (لحاف کانوں پر سرک آیا)۔۔۔''تو گویا آج ہم لوگوں سے پہلے جاگے ہیں۔۔۔۔۔بہت ہی پہلے یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے۔۔۔۔۔کیا بات ہے۔خداوندانِ کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے۔۔۔۔۔'' (لحاف سر پر)۔۔۔۔۔''بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔۔۔۔۔'' (آنکھیں بند)۔۔۔۔۔''تو اب چھ بجے ہیں تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کونسی کتاب پڑھیں۔شیکسپیئر یا ورڈزورتھ؟ میں جانوں شیکسپیئر بہتر ہوگا۔اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے

بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے؟ پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈز ورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہو گا اور دل اور دماغ نیچر کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے۔۔۔ لیکن شیکسپیئر۔۔۔۔۔ نہیں ورڈزورتھ ہی ٹھیک رہے گا۔۔۔۔۔ شیکسپیئر۔۔۔۔۔ ہیملٹ۔۔۔۔۔ لیکن ورڈزورتھ۔۔۔۔ لیڈی میکبتھ۔۔۔۔۔ دیوانگی۔۔۔۔۔ سبزہ زار۔۔۔۔۔ سنجر سنجر۔۔۔۔۔ باد بہاری۔۔۔۔۔ صدِ ہوس۔۔۔۔۔ کشمیر۔۔۔۔۔ میں آفت کا پرکالہ ہوں۔۔۔۔۔

یہ معمہ اب مابعد الطبیعات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈزورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے۔ اس میں نامعلوم کیا بھید ہے!

کالج ہال میں لالہ جی ملے' کہنے لگے "مسٹر صبح میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی۔ آپ نے جواب نہ دیا؟"

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا" اوہو! لالہ جی یاد نہیں۔ میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا؟ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔"

بولے" وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں۔۔۔۔۔ اس کے بعد۔۔۔۔۔ کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی آپ بولے ہی نہیں۔"

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے۔ پھر یکایک ایک محبوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کر کہا" ہاں ٹھیک ہے۔ میں اس وقت۔۔۔۔۔ اے۔۔۔۔۔ نماز پڑھ رہا تھا۔"

لالہ جی مرعوب ہو کر چل دیئے اور ہم اپنے زہد و اتقا کی مسکینی پر سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہی ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھ بجے۔ جاگنا نمبر دو دس بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

جب دل مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ "ہمارا فرق نازمحو بالش کم خواب ہو" اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پر پیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو۔

"تم جاگو موہن پیارے"

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں۔ دل آویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور گیت "سانوری صورت توری من کو بھائی" کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے۔

نصیب یہ ہے کہ پہلے "مسٹر، مسٹر" کی آواز اور دروازے کی دنادن سامعہ نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں گڑیوں کے گر پڑنے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دیگچیوں کے الٹ جانے۔ دروازوں کے بند ہونے کتابوں کے جھاڑنے۔ کرسیوں کے گھسیٹنے ۔۔۔۔۔۔۔۔ کلیاں اور غرغرے کرنے۔ کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہہ ٹھمریاں ہیں۔ اندازہ کر لیجئے کہ ان سازوں میں سرتال کی کس قدر گنجائش ہے۔

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

☆☆☆

فرہنگ

چوبی: لکڑی کا۔ کلنڈر: کیلنڈر، جنتری، تقویم، نظام، فہرست۔ صبح کاذب: صبح کی روشنی جس کے بعد پھر اندھیرا ہو جاتا ہے۔ تقطیع: ٹکڑے ٹکڑے کرنا، علم عروض کی اصلاح میں شعراء کے اجزاء کو بحر کے اوزان پر وزن کرنا۔ لغویات: لغویت کی جمع، بے ہودہ باتیں یا افعال، بری حرکات۔ خرما: کھجور، چھوہارا، کھجور کی شکل کی ایک مٹھائی۔ دیباچہ: کتاب کا مقدمہ، پیش لفظ، تمہید، آراستہ۔ طمانیت: دل جمعی، اطمینان، تسلی۔ کنٹوپ: کانوں تک پہنچنے والا ٹوپ۔ اولوالعزمی: بلند ہمتی، جرأت، استقلال۔ کسالت: سستی، کاہلی، آلکسی۔ الحاد: سیدھے راستے سے کترا جانا، دین حق سے پھر جانا، ملحد ہو جانا۔ جانوں: میرے خیال میں، میرے علم کے مطابق۔ آفت کا پرکالہ: شوخ و شنگ، تحریر، شریر، عیار (مجازاً) معشوق۔ مابعد الطبیعات: الٰہیات، فوق الفطرت۔ تعمق: غور کرنا، گہرائی، باریک بینی۔ مرعوب: رعب میں آیا ہوا، ڈرا ہوا، ڈرنے والا۔ زہد و اتقا: پرہیزگاری، گناہوں سے بچنا، تقویٰ۔ بالش: تکیہ، مسند، سرہانہ، بربط: ایک قسم کا ساز، عود۔

انجام بخیر

(منظر)

ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور ایک لرزہ براندام کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں۔

زمین پر ایک طرف چٹائی بچھی ہے جس پر بے شمار کتابوں کا انبار لگا ہے۔ اس انبار میں سے جہاں جہاں کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہے وہاں شیکسپیئر' ٹالسٹائی' ورڈزورتھ وغیرہ مشاہیر ادب کے نام دکھائی دے جاتے ہیں۔

باہر کہیں پاس ہی کتے بھونک رہے ہیں۔ قریب ہی ایک برات اتری ہوئی ہے اس کے بینڈ کی آواز سنائی دے رہی ہے جس کے بجانے والے دق' دمہ' کھانسی اور اسی قسم کے دیگر امراض میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ ڈھول بجانے والے کی صحت البتہ اچھی ہے۔

پطرس نامی ایک نادار معلم میز پر کام کر رہا ہے۔ نوجوان ہے لیکن چہرے پر گذشتہ تندرستی اور خوش باشی کے آثار کہیں کہیں باقی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے۔

سامنے لٹکی ہوئی ایک جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ ہے۔

باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے پطرس اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ تین طالب علم نہایت اعلیٰ لباس زیب تن کیے اندر داخل ہوتے ہیں۔

پطرس: حضرات اندر تشریف لے آیئے آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے لہٰذا اے میرے

فرزندو! اس انبار سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کر لو اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

(کمرے میں ایک پُراسرار نور سا چھا جاتا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)۔

طالب علم: (تینوں مل کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے اے ہمارے محترم استاد! ہم تمہارا حکم ماننے کو تیار ہیں۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

(کتابوں کو جوڑ کر ان پر بیٹھ جاتے ہیں)

پطرس: کہو اے ہندوستان کے سپوتو! آج تم کو کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی۔

پہلا طالب علم: اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ اُتارنے آئے ہیں۔

دوسرا طالب علم: اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔

تیسرا طالب علم: اے ہمارے مہربان! ہم تیری محنتوں کا پھل تیرے پاس لائے ہیں۔

پطرس: یہ نہ کہو' یہ نہ کہو خود میری محنت ہی میری محنت کا پھل ہے۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا۔ اس کا معاوضہ مجھے اس وقت وصول ہو گیا جب میں نے تمہاری آنکھوں میں ذکاوت چمکتی دیکھی۔ آہ! تم کیا جانتے ہو کہ تعلیم و تدریس کیسا آسمانی پیشہ ہے۔ تاہم تمہارے الفاظ سے میرے دل میں ایک عجیب مسرت سی بھر گئی ہے۔ مجھ پر اعتماد کرو' بالکل مت گھبراؤ جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم: (سرو قد اور دست بستہ کھڑا ہو کر) اے محترم اُستاد! ہم علم کی بے بہا دولت سے محروم تھے۔ درس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس نہ بجھ سکتی تھی۔ پولیس اور سول سروس کے امتحانات کی آزمائش کڑی ہے تو نے ہماری دستگیری کی اور ہمارے تاریک دماغوں میں اُجالا ہو گیا۔ مقتدر مُعلّم! تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ ہم تیری خدمتوں کا حقیر سا معاوضہ پیش کرنے آئے ہیں۔ تیرے عالمانہ تبحر اور تیری بزرگانہ شفقت کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ تاہم اظہار تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم تیری خدمت میں پیش کریں اسے قبول کر۔ کہ ہماری احسان مندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس: تمہارے الفاظ سے ایک عجیب بیقراری میرے جسم پر طاری ہوگئی ہے۔

(پہلے طالب علم کا اشارہ پا کر باقی دو طالب علم بھی کھڑے ہو جاتے ہیں باہر بینڈ یک لخت زور زور سے بجنے لگتا ہے)۔

پہلا طالب علم: (آگے بڑھ کر) اے ہمارے مہربان! مجھ حقیر کی نذر قبول کر (بڑے ادب واحترام کے ساتھ اٹھنی پیش کرتا ہے)۔

دوسرا طالب علم: (آگے بڑھ کر) اے فرشتے! میرے ہدیے کو شرف قبولیت بخش (اٹھنی پیش کرتا ہے)۔

تیسرا طالب علم: (آگے بڑھ کر) اے نیک انسان! مجھ ناچیز انسان کو مُفتخر فرما (اٹھنی پیش کرتا ہے)۔

پطرس: (جذبات سے بے قابو ہو کر رقت انگیز آواز سے) اے میرے فرزندو! خداوند کی رحمت تم پر نازل ہو۔تمہاری سعادت مندی اور فرض شناسی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔تمہیں اس دنیا میں آرام اور آخرت میں نجات نصیب ہو اور خدا تمہارے سینوں کو علم کے نور سے منور رکھے۔(تینوں اٹھنیاں اٹھا کر میز پر رکھ لیتا ہے)۔

طالب علم: (تینوں مل کر) اللہ کے برگزیدہ بندے ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔اب اجازت چاہتے ہیں کہ گھر پر ہمارے والدین ہمارے لیے بے تاب ہوں گے۔

پطرس: خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہاری علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(طالب علم چلے جاتے ہیں)

پطرس: (تنہائی میں سربسجود ہو کر) باری تعالیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنی ناچیز محنت کے ثمر کے لیے بہت دنوں انتظار میں نہ رکھا۔تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں لیکن ہماری کم مایگی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ تو میرے وسیلے سے اوروں کو بھی رزق پہنچاتا ہے اور جو ملازم میری خدمت کرتا ہے اس کا بھی کفیل تو نے مجھ ہی کو بنا رکھا ہے۔تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں اور تیری بخشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔

(کمرے میں پھر ایک پُراسرار سی روشنی چھا جاتی ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔کچھ دیر کے بعد پطرس سجدے سے سر اٹھاتا ہے اور ملازم کو

آواز دیتا ہے)۔

پطرس: اے خدا کے دیانتدار اور محنتی بندے! ذرا یہاں تو آئیو۔

ملازم: (باہر سے) اے میرے خوش خصال آقا! میں کھانا پکا کر آؤں گا کہ تعجیل شیطان کا کام ہے۔

(ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے دگنے لمبے ہو گئے ہیں)۔

پطرس: آہ! انتظار کی گھڑیاں کس قدر شیریں ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کس خوش اسلوبی سے بینڈ کی آواز کے ساتھ مل رہی ہے۔

(سر بسجود گر پڑتا ہے)۔

(پھر اٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے اٹھنیوں پر نظر پڑتی ہے ان کو فوراً ایک کتاب کے نیچے چھپا دیتا ہے)۔

پطرس: آہ! مجھے زر و دولت سے نفرت ہے۔ خدایا! میرے دل کو دنیا کے لالچ سے پاک رکھیو۔

(ملازم اندر آتا ہے)۔

پطرس: اے مزدور پیشہ انسان مجھے تجھ پر رحم آتا ہے کہ ضیائے علم کی ایک کرن بھی کبھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ تاہم خداوند تعالیٰ کے دربار میں تم ہم سب برابر ہیں تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ تیری تنخواہ کی ادائیگی کا وقت سر پر آ گیا۔ خوش ہو کہ آج تجھے اپنی مشقت کا معاوضہ مل جائے گا۔ یہ تین اٹھنیاں قبول کر اور باقی ساڑھے اٹھارہ روپے کے لیے کسی لطیفہ غیبی کا انتظار کر۔ دنیا امید پر قائم ہے اور مایوسی کفر ہے۔

(ملازم اٹھنیاں زور زور سے زمین پر پھینک کر گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ بینڈ زور سے بجنے لگتا ہے)۔

پطرس: خدایا! تکبر کے گناہ سے ہم سب کو بچائے رکھ اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کا سا غرور ہم سے دور رکھ۔

(پھر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)۔

باورچی خانے میں کھانا جلنے کی ہلکی ہلکی بو آرہی ہے۔۔۔۔۔ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے چوگنے لمبے ہو گئے ہیں۔بینڈ بدستور بج رہا ہے۔

یک لخت باہر سڑک پر موٹروں کے آکر رک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(تھوڑی دیر بعد کوئی شخص دروازے پر دستک دیتا ہے)۔

پطرس: (کام پر سے سر اٹھا کر) اے شخص تو کون ہے؟

ایک آواز (باہر سے) حضور میں غلاموں کا غلام ہوں اور باہر دست بستہ کھڑا ہوں کہ اجازت ہو تو اندر آؤں اور عرض حال کروں۔

پطرس: (دل میں) میں اس آواز سے نا آشنا ہوں لیکن لہجے سے پایا جاتا ہے کہ بولنے والا کوئی شائستہ شخص ہے۔خدایا! یہ کون ہے (بلند آواز سے) اندر آجائیے۔

(دروازہ کھلتا ہے اور ایک شخص لباس فاخرہ پہنے اندر داخل ہوتا ہے۔گو چہرے سے وقار ٹپک رہا ہے)۔

لیکن نظریں زمین دوز ہیں اور ادب واحترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔

پطرس: آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے لیکن جاہ وحشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔علم بڑی نعمت ہے لہٰذا اے محترم اجنبی! اس انبار میں سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کرلو اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

اجنبی: اے برگزیدہ شخص! میں تیرے سامنے کھڑے رہنے ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

پطرس: تمہیں کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

اجنبی: اے ذی علم محترم! گو تم میری صورت سے واقف نہیں لیکن میں شعبہ تعلیم کا افسر ہوں اور شرمندہ ہوں کہ میں آج تک کبھی نیاز حاصل کرنے کے لیے حاضر نہ ہوا۔میری اس کوتاہی اور غفلت کو اپنے علم وفضل کے صدقے معاف کردو۔

(آبدیدہ ہو جاتا ہے)۔

پطرس: اے خدا! کیا یہ سب وہم ہے کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟

اجنبی: مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے نیک اور برگزیدہ انسان سے اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچنبھا معلوم ہوتا ہے لیکن مجھ پر یقین کرو میں فی الحقیقت یہاں تمہاری خدمت میں کھڑا ہوں اور تمہاری آنکھیں تمہیں ہرگز دھوکا نہیں دے رہیں۔اے شریف اور غم زدہ انسان! یقین نہ ہو تو میرے چٹکی لے کر میرا امتحان کرلو۔

(پطرس اجنبی کے چٹکی لیتا ہے۔اجنبی زور سے چیختا ہے)۔

پطرس: ہاں اب مجھے کچھ کچھ یقین آ گیا لیکن حضور والا آپ کا یہاں قدم رنجہ فرمانا میرے لیے اس قدر باعث فخر ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

اجنبی: ایسے الفاظ کہہ کر مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو اور یقین جانو کہ میں اپنی گذشتہ خطاؤں پر بہت نادم ہوں۔

پطرس: (مبہوت ہو کر) مجھے اب کیا حکم ہے؟

اجنبی: میری اتنی مجال کہاں کہ میں آپ کو حکم دوں البتہ ایک عرض ہے اگر آپ منظور کر لیں تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھوں۔

پطرس: آپ فرمایئے میں سن رہا ہوں گو مجھے یقین نہیں کہ عالم بیداری ہے۔

(اجنبی تالی بجاتا ہے۔چھ خُدّام بڑے بڑے صندوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں اور زمین پر رکھ کر بڑے ادب سے کورنش بجا کر چلے جاتے ہیں)۔

اجنبی: (صندوق کے ڈھکنے کھول کر) میں بادشاہ معظم' شاہزادہ ویلز' وائسرائے ہند اور کمانڈر انچیف ان چاروں کے ایماء پر یہ تحائف آپ کی خدمت میں آپ کے علم و فضل کی قدر دانی کے طور پر لے کر حاضر ہوا ہوں (بھرائی ہوئی آواز سے) ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجئے۔ورنہ ان سب کا دل ٹوٹ جائے گا۔

پطرس: (صندوق کو دیکھ کر) سونا! اشرفیاں! جواہرات! مجھے یقین نہیں آتا (آیۃ الکرسی پڑھنے لگتا ہے)۔

اجنبی: ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجئے۔(آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں)۔
گانا ''آج موری انکھیاں پل نہ لاگیں''۔

پطرس: اے اجنبی! تیرے آنسو کیوں گر رہے ہیں اور تو کیوں گا رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں۔ یہ تیری کمزوری کی نشانی ہے خدا تجھے تقویت اور ہمت دے۔ میں خوش ہوں کہ تو اور تیرے آقا علم سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ بس اب جا کہ ہمارے مطالعے کا وقت ہے کل کالج میں اپنے لیکچروں سے ہمیں چار پانسو روحوں کو خواب جہالت سے جگانا ہے۔

اجنبی: (سسکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو تو میں بھی حاضر ہو کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوں۔

پطرس: خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہارے علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(اجنبی رخصت ہو جاتا ہے۔ پطرس صندوقوں کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے اور پھر یک لخت مسرت کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔ کمرے میں ایک پراسرار نور چھا جاتا ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ باہر بینڈ بدستور بج رہا ہے)۔

☆☆☆

فرہنگ

پوچ: لغو، بے ہودہ، مہمل، ذلیل، حقیر، پاجی، کمینہ۔ ذکاوت: ذہن کی تیزی، ذہانت، تیزی، طبع، تیز فہمی۔ تبحر: کسی علم یا فن میں سمندر کی طرح بے پایاں ہونا، کسی چیز میں کمال حاصل ہونا۔ مفتخر فرمانا: فخر عطا فرمانا، عزت بخشنا۔ کم مائیگی: بے حیثیت ہونا، بے بضاعتی۔ تعجیل: جلدی کرنا، جلدی، عجلت۔ لطیفہ غیبی: غیب سے کوئی اچھی خبر۔ لباس فاخرہ: بادشاہ کی طرف سے دیا گیا لباس، مرتبہ، عہدہ۔ مبہوت: حیران، متحیر، ہکا بکا، دیوانہ، مدہوش۔ کورنش: خمیدگی، جھکاؤ، تسلیم، بندگی، آداب، جھک کر سلام کرنا۔ ایماء: اشارہ، اشارہ کرنا۔

جلے دِل کے پھپھولے

ایک دن صبح کے وقت زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میں بستر میں لیٹا ہوا بیرونی آب و ہوا کا اندازہ لگا رہا تھا۔ سردی اور کیچڑ کے متعلق تو توقعات یقین کے درجے تک پہنچ چکی تھیں۔ کالج جانے نہ جانے کا سوال غور طلب تھا۔ ایک خیال آیا کہ دس بج چکے ہوں تو کلاس میں دیر سے پہنچنا از حد بد اخلاقی ہوگی۔ ڈر کے مارے گھڑی کو نہ دیکھا کہ مبادا نصیب دشمناں سوئیاں ابھی اس منزل تک نہ پہنچتی ہوں جو میرے لیے منزل مقصود ہے۔ پھر خیال آیا کہ ایسی تیز ہوا میں انفلوائنزا کا بہت خطرہ ہے۔ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ صحت کو تعلیم پر مقدم سمجھنا چاہیے۔ پھر ماں باپ کا لاڈا بیٹا خاکم بدہن اگر مجھے ایک چھینک بھی آ گئی تو گھر میں بھونچال آ جائے گا۔ سر کے دو چار بال اور ایک کان لحاف سے باہر جھانکنے کی جسارت فرما رہے تھے۔ کچھ لحاف کی گوشمالی کی کچھ ان کی اور پھر اپنے ضمیر سمیت بستر کی گہرائیوں اور تاریکیوں میں غوطہ زن ہو کر سو گیا جس میں انسان سن تو سب کچھ لیتا ہے بولنا نہیں چاہتا میں نے اس مراقبے میں دو چار منٹ گنوائے ہوں گے کہ ایک صاحب نازل ہوئے دروازہ انہوں نے اس بے تکلفی سے کھولا جیسے خانہ واحد ہو اور داخل اس شان سے ہوئے گویا راجہ اندر ہیں کہ دربار تشریف لا رہے ہیں۔ ان کی ٹوپی کو دیکھ کر شاخ بار دو کا مضمون سوجھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی کنپٹی پر دست غیر کوئی پھوڑا نکل آیا ہو اور ٹوپی کو محض اخفائی مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہوں۔ میں نے اپنا خواب آلودہ چہرہ ان کی باصرہ خراشی کو مکمل طور پر لحاف سے باہر نکالا۔ انہوں نے طوعاً و کرہاً میری جانب دیکھا۔ سر کو ایک دل فریب جنبش دے کر ٹوپی کے پھندے میں ایک طوفان پیدا کیا اور پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر بولے کیوں جناب! مسٹر بخاری

اسی کمرے میں رہتے ہیں۔ میں نے کہا پیرومرشد درست۔ کہنے لگے وہ اس وقت کہاں ہوں گے؟ میں نے جواب میں عرض کیا کہ جناب! اس صحرا نورد کا ٹھکانا ٹھیک تو عالم الغیب ہی کو معلوم ہوسکتا ہے لیکن جہاں تک اس خاکسار نے غور وخوض کیا ہے۔ بندہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ بخاری صاحب اس وقت اپنے بستر میں استراحت فرما رہے ہوں گے واللہ اعلم بالصواب۔ آپ سخن شناس واقع ہوئے تھے۔ مربیانہ انداز میں مسکرا دیئے میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا جس کی پشت پر میری قمیض جسم مصلوب کی طرح رحم طلب پیرائے میں لٹک رہی تھی۔ آپ نے پہلے قمیض جسم مصلوب کی طرح سے بڑی استغناء سے فرش پر پھینک کر بیٹھنے کے لیے اپنی ٹانگوں اور کمر میں خم پیدا کیا پھر اپنے کوٹ کو جو پتلون اور کرسی کے درمیان حائل ہونے کی دھمکیاں دے رہا تھا اور دونوں ہاتھوں سے منع کیا۔ آخرکار بیٹھ گئے اور نگاہ کو چھت پر گاڑ کر بولے۔

آپ راوی کے ایڈیٹر ہیں آپ غضب کے قیافہ شناس ہیں جی ہاں مجھے اس جرم کا اعتراف ہے تو میں آپ سے دو ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ شوق سے پوچھئے میں جوتش وتش تو نہیں جانتا البتہ بچپن میں پہیلیاں۔ آپ کے راوی میں مَیں نے کبھی اردو مضامین نہیں دیکھے۔ میں آپ سے اس کی وجہ دریافت کرسکتا ہوں۔ کیوں نہیں بے شک تو صاحب وجہ یہ ہے کہ آپ کی قوت باصرہ نہایت راستباز ہے اگر اردو وہاں چھپا نہ ہوتو آپ دیکھیں کیسے؟ آپ مجھے سمجھے نہیں۔ مجھے آپ کے سوال کو مختلف الفاظ میں دہرانا پڑے گا۔ دیکھئے نا! میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اردو کے مضامین کیوں نہیں چھاپتے۔ سمجھے آپ میں نے آہ بھر کر کہا جناب! یہ ایک داستان درد ہے اور حسب معمول بہت طویل۔ نہیں نہیں آپ بے تکلف کہئے مجھے راوی سے بہت ہمدردی ہے۔ یہ آپ کی ذرہ پروری ہے صاحب کیا عرض کروں میں خوشی سے اردو مضامین چھاپ دیا کروں، اگر کوئی خدا کا بندہ لکھنے کی تکلیف فرمائے مجھے تو خود۔۔۔

میں سمجھ گیا یعنی آپ کو کوئی ادیب نہیں ملتا تو یوں کہئے نا! میں جانتا ہوں کہ آج کل کے زمانے میں سخن گو بہت کمیاب ہیں۔ اب جناب! اگر میں آپ کو خود اپنی غزل راوی کے لیے دے دوں تو پھر۔۔۔ پھر تو حضرت کیا کہنے میں سنہری حروف میں مرصع کاغذ پر چھپوا کر غالب مرحوم کے مزار پر آویزاں کروا دوں۔ وہ تو خیر ایک دوسرا سوال ہے "راوی" کے

مشکلات تو قطعاً حل ہو جائیں' بالکل مجھے یقین ہے اس کے بعد پرنسپل صاحب میری تصویر ورینکلر لائبریری کی دیوار پر۔

آپ کو معلوم ہے میں شاعر ہوں' شاعری کوئی معمولی بات نہیں' شاعری بکر جاں معتثن ہے' شاعری کوہ کندی وکاہ برآوردن ہے' شاعری...... میں آپ سے کیا کہوں' آپ خود شاعر نہیں' آپ نہیں سمجھ سکتے' تو جانے دیجئے۔۔۔ لیکن ان کی فصاحت و بلاغت کو میری کم فہمی بھی مانع نہ ہوئی یوں گھنٹے کے بعد غزل اور دردسر دے کر تخفیف تصدیع کر گئے۔

ان کے تشریف لے جانے کے بعد میں نے غزل کو شروع سے آخر تک پڑھا' پڑھا کیا؟ اس کا مطالعہ کیا' اس کا وظیفہ کیا' لیکن مجھے پھر بھی بحر کا پتہ نہ لگا۔ قافیہ نوازی میں آں جناب! نے جو جلت فرمائی تھی میرے قدامت پسند دماغ فرسودہ سے بالاتر تھی۔ ترکیبوں میں جو آپ نے فارسیت بگھاری تھی' خلق میں خواہش پیدا کرتی تھی۔ لغویت اور بے مطلبی کو جس خوبی سے انہوں نے نبھایا تھا انہی کا کام تھا۔ بحیثیت مجموعی کلام ایسا تھا گویا مرزا عبد القادر بیدل ہذیان کی حالت میں کچھ فرما گئے ہیں' میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کاغذ کے پرزے کو پھاڑ ڈالا اور چار دانگ وکٹوریہ ہوٹل میں ان پرزوں کو جس قدر وسعت میں ممکن ہو سکتا تھا بکھیر دیا تاکہ اس دنیا میں ان کو پھر یکجا ہو جانا محال ہو جائے۔ حشر کے دن جب وہ کاغذ پھر اصلی شکل اختیار کرے گا تو شاعر کے بائیں ہاتھ میں نظر آئے گا۔

مندرجہ بالا واقعہ مبالغہ سے بالکل مبرا ہے نہ صرف یہ بلکہ ایک ایسا سانحہ ہے جو بالحاظ اپنی نوعیت کے ہر دوسرے تیسرے دن مجھ بدنصیب کو پیش آتا ہے۔ اردو کے قدردان اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ "راوی" کا اردو حصہ بالکل ہی مفقود ہو گیا۔ میں ان کو کیا جواب دوں یہ کہہ دیتا ہوں کہ کالجوں میں اردو انشاء پردازوں کی بہت قلت ہے۔ علی گڑھ میگزین میرے سامنے کر دیتے ہیں اور اتنا نہیں سوچتے کہ علی گڑھ کے مردم خیز خطے اور گورنمنٹ کالج کے سنگلاخ میں کس قدر فرق ہے۔ ان کو یہ کون کہے کہ وہاں کے اولڈ بوائز اور موجودہ طلباء کی فہرست میں آپ کو اکثر مشاہیر ادب کے نام نظر آئیں گے اور گورنمنٹ کالج کا یہ حال ہے کہ آزاد مرحوم جس شاندار ہستی کو ایک دراز عرصے تک اس جگہ سے وابستگی تھی اور کالج ہال میں ان کی تصویر تک موجود نہیں سخن ورشناسی کا یہ عالم ہے تو سخن شناسی کیا ہوگی۔ اور سخن گوئی تو کس،

شمار میں ہے۔ اٹھتی جوانی کو غزل کہنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ سو ہے لیکن ہمارے نوجوان مصور جب ایسی تصویریں کھینچتے ہیں تو عجب قلم طرازیاں فرماتے ہیں۔ ناک اقبال کی' کان اکبر کا' آنکھیں غالب کی قافیے انگریزی بحر۔ اُردو ہوتا ہے تو سرقہ نما سرقہ ہوتا ہے اور بالکل ہی بے حجاب ہم سے اتنی ناز برداری نہیں ہوسکتی کہ اسے راوی میں چھاپ دیں۔

نثر سے ان کو نفرت ہے۔ انسان میں منجملہ اور کمزوریوں کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو طبعاً شاعر سمجھتا ہے۔ اس کمزوری کا خمیازہ ہم کو اس شکل میں اٹھانا پڑتا ہے کہ ایک تو نظم نما نظموں کا انبار ہماری ردی کی ٹوکری میں جمع ہو جاتا ہے۔ دوسرے نثر میں ہم کو خط تک کوئی نہیں لکھتا کہ اسی کو راوی میں چھاپ دیں۔ خواہ ہمیں لفافے ہی چھاپنا پڑے۔ لیکن جب دوستوں کے طعن و تشنیع نے ہم کو بالکل ہی عاجز کر دیا تو ہم سید امتیاز علی تاج کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ بھائی جو توجہ کہکشاں مرحوم کو یاد کرتے تھے وہ اپنی ''راوی'' زندہ درگور کی طرف منتقل کر دو کہ تم اور میں دونوں سعادت دارین حاصل کریں۔ انہوں نے ہماری درخواست کو قبول کرلیا۔ ان کا قابل قدر مضمون خرافات اس بات کا شاہد ہے کہ ارادہ ہے کہ کسی دن اسی طرح ہاتھ جوڑ کر منشی تصدق حسین صاحب خالد کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور عرض کروں گا کہ اے وہ کہ جس کے دم سے بزم سخن پر رونق ہے ان معنوں میں کہ مردہ نہیں زندہ ہے اور اے وہ کہ جو گورنمنٹ کالج کے عنفوان پیشہ و دیرینہ کا وارث جائز و برحق ہے۔ خدا کے لیے ''راوی'' کو دیکھ کہ تیری طرف اُمید کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ نظم کے میدان کے لیے ''راوی'' کو دیکھ کہ تیری طرف اُمید کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے نظم کے میدان کو چھوڑ کر شاہسواروں کے ہجوم میں تجھ مجھ جیسے پیادہ پا روندے جائیں گے۔ نثر کے ملک میں آ' جہاں قحط الرجال ہے اس لیے موقع ہے لہٰذا یقین ہے۔

پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب اور مولانا قاضی فضل حق صاحب سے شکایت کرنے کی جرأت تو ہمیں بھلا کیسے ہوسکتی ہے ہر جمعہ کے بعد خشوع و خضوع سے دعا کر دیتے ہیں کہ خدایا! ان بزرگوں کو ''راوی'' سے جو اعتنائی ہے اس کی وجہ ہمیں کشف کے ذریعے بتا دے۔ بیشتر اس کے کہ ''راوی'' بالکل مایوس ہوکر ان کے متعلق یہ سوچا کرے کہ:

(ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں)

فرہنگ

مبادا: کلمۂ دُعائیہ، ایسا نہ ہو، خدا نہ کرے، خدانخواستہ۔ خاکم بدہن: میرے منہ میں خاک، کوئی بُری بات کہنی ہو تو کہتے ہیں۔ گوشمالی: کان اینٹھنا: تنبیہ کرنا۔ مراقبے: مراقبہ، غور، تصور، سوچ بچار، دھیان، گیان، سب چیزوں کو چھوڑ کر خدا کا دھیان کرنا۔ اخفائی: پوشیدگی، رازدانی۔ طوعاً و کرہاً: چار و ناچار، جبراً، خواہ مخواہ۔ استراحت: آرام چاہنا، راحت طلب کرنا، سکھ، چین۔ مربیانہ: لفظ مربی سے ہے، پرورش کرنے والا، تربیت کرنے والا، سرپرست، حامی۔ مصلوب: صلیب پر چڑھایا گیا، سولی دیا گیا۔ استغناء: بے پروائی، بے نیازی، بے فکری۔ تخفیف: کمی، گھٹاؤ، ہلکا کرنا، حروف کے بولنے میں ہلکا یا کم کرنا، افاقہ، آرام۔ تصدیع: دردِ سر، دکھ، تکلیف۔ جلت: پھرتی، چالاکی، رفتار، گردش، حرکات۔ ہذیان: بیہودہ گوئی۔ چاردانگ: ہر طرف، چاروں طرف، کل، تمام۔ سرقہ: چوری۔ عنفوان: آغاز، شروع، تازگی، خوبصورتی۔ اعتنائی: غم خواری، ہمدردی، پروا کرنا۔

کاغذی روپیہ

خواجہ علی احمد شہر کے بڑے سوداگر تھے۔ لاکھوں کا کاروبار چلتا تھا۔ لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بچہ بچہ ان کی دیانتداری سے واقف تھا اور ہر شخص جانتا تھا کہ خواجہ علی احمد قول کے سچے اور بات کے پکے تھے۔

ایک دن انہوں نے اپنے ایک آدمی کو جوتے والے کی دکان سے جوتا خریدنے بھیجا۔ جوتے کی قیمت بیس روپے تھی لیکن بجائے اس کے کہ خواجہ علی احمد اپنے نوکر کو بیس روپے دے کر بھیجتے انہوں نے نوکر کے ہاتھ کریم خاں جوتے والے کے نام یہ رقعہ لکھ بھیجا۔

''میاں کریم خاں! مہربانی کر کے ہمارے آدمی کو بیس روپے کا ایک جوتا دے دو ہمارا یہ رقعہ اپنے پاس سنبھال کر رکھ چھوڑو۔ جب تمہارا دل چاہے یہ رقعہ آ کے ہم کو یا ہمارے منشی کو دکھا دینا اور بیس روپے لے جانا۔ یہ رقعہ اگر تم کسی اور شخص کو دینا چاہو تو بے شک دے دو۔ جو ہمارے پاس آئے گا ہم اس کو بیس روپے دے دیں گے۔'' راقم خواجہ علی احمد

دکاندار نے جب رقعے کے نیچے خواجہ علی احمد کے دستخط دیکھے تو اسے اطمینان ہوا' جانتا تھا کہ خواجہ صاحب مکرنے والے آدمی نہیں اور پھر لاکھوں کے آدمی ہیں۔ روپے نہیں بھیجے تو نہ سہی' یہ رقعہ کیا روپوں سے کم ہے؟ جب چاہوں گا' رقعہ جا کر دے دوں گا اور روپیہ لے لوں گا۔ چنانچہ اس نے بغیر تامل کے جوتا بھیج دیا۔

تھوڑی دیر بعد کریم خاں دکاندار کے پاس عبد اللہ حلوائی آیا اور کہنے لگا'' میاں کریم خاں! میرے تمہاری طرف پچیس روپے نکلتے ہیں ادا کر دو تو تمہاری بہت مہربانی ہو گی۔''

کریم خاں نے کہا "ابھی لو یہ پانچ تو نقد لے لو باقی بیس روپے مجھے خواجہ علی احمد سے لینے ہیں یہ دیکھو ان کا رقعہ ذرا ٹھہر جاؤ' تو میں جا کے ان سے بیس روپے لے آؤں۔"

عبداللہ بھی خواجہ علی احمد کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ شہر بھر میں خواجہ صاحب کی ساکھ قائم تھی کہنے لگا "تم یہ رقعہ مجھے ہی کیوں نہ دے دو میں ان سے بیس روپے لے آؤں گا کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ جو شخص یہ رقعہ لائے گا اس کو بیس روپے دے دیئے جائیں گے۔"

کریم خاں نے کہا "یونہی سہی۔" چنانچہ عبداللہ حلوائی نے بیس روپے کے بدلے وہ رقعہ قبول کر لیا۔

کئی دنوں تک یہ رقعہ یونہی ایک دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ کر شہر بھر میں گھومتا رہا خواجہ علی احمد پر لوگوں کو اس قدر اعتبار تھا کہ ہر ایک اس رقعے کو بیس روپے کی بجائے لینا قبول کر لیتا کیونکہ ہر ایک شخص جانتا تھا کہ جب چاہوں گا اسے خواجہ صاحب کے منشی کے پاس لے جاؤں گا اور وہاں سے بیس روپے وصول کر لوں گا۔

ہوتے ہوتے یہ رقعہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گیا جس کا بھائی کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ یہ شخص اپنے بھائی کو منی آرڈر کے ذریعے بیس روپے بھیجنا چاہتا تھا۔ ڈاک خانے والوں نے اس رقعہ کو بیس روپے کے عوض لینا قبول نہ کیا۔ چنانچہ وہ شخص سیدھا خواجہ علی احمد کی کوٹھی پر پہنچا۔ رقعہ منشی کو دیا۔ منشی نے بیس روپے کھن کھن گن دیئے اس نے روپے جا کر ڈاک خانے کو دیئے اور انہوں نے آگے اس کے بھائی کو بھیج دیئے۔

اس مثال سے یہ ظاہر ہوا کہ محض ایک کاغذ کا پرزہ کتنی مدت تک روپے کا کام دیتا رہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کاغذ کے نیچے ایک ایسے شخص کے دستخط تھے جس کی دولت، کا سب کو علم تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ شخص جب چاہے بیس روپے ادا کر سکتا ہے اور قول کا اتنا پکا ہے کہ کبھی ادا کرنے سے انکار نہ کرے گا۔

اگر ایسے ہی ایک رقعے کے نیچے ہم یا تم دستخط کر دیتے تو کوئی بھی اسے روپے کے بدلے میں قبول نہ کرتا۔ اول تو ہمیں جانتا ہی کون ہے اور جو جانتا بھی ہے وہ کہے گا۔ ان کا کیا پتہ آدمی نیک اور شریف اور دیانتدار سہی' لیکن خدا جانے ان کے پاس بیس روپے ہیں بھی یا نہیں؟ کیا معلوم ہم مانگنے جائیں اور وہاں کوڑی بھی نہ ہو۔

خواجہ علی احمد کا رقعہ گویا ایک قسم کا نوٹ تھا۔ سرکاری نوٹ بھی بالکل یہی چیز ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے نیچے سرکار کی طرف سے سرکاری خزانے کے ایک افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔ اگر تم دس روپے کے نوٹ کو لے کر دیکھو تو اس پر اوپر حکومت پاکستان اور اس کے نیچے لکھا ہوتا ہے کہ "میں اقرار کرتا ہوں کہ عند المطالبہ حامل ہذا کو دس روپیہ سرکاری خزانہ کراچی سے ادا کروں گا۔" اس عبارت کے نیچے سرکاری افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔۔۔

خواجہ احمد علی کو تو صرف ایک شہر کے لوگ جانتے تھے۔ حکومت پاکستان کو ملک کا ہر آدمی جانتا ہے بلکہ اور ملکوں میں بھی اس کی ساکھ قائم ہے اس لئے سرکاری نوٹ کو ہر شخص کو بلا تامل قبول کر لیتا ہے اور کوئی قبول کیوں نہ کرے، لوگ جانتے ہیں کہ جب چاہیں خزانے میں جا کر اس کے روپے بھنا سکتے ہیں۔

خواجہ علی احمد کے رقعے اور سرکاری نوٹ میں ایک فرق اور بھی ہے۔ خواجہ علی احمد کا رقعہ تو ڈاک خانے والوں نے قبول نہ کیا تھا لیکن سرکاری نوٹ انہیں ضرور ہی قبول کرنا پڑتا۔ سرکاری نوٹوں کو قانونی طور پر ملک کا سکہ قرار دیا گیا ہے اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان کو روپے کے بدلے لینے سے انکار کرے۔ اگر تمہیں کسی شخص نے دس چاندی کے روپے قرض دیئے تھے اور اب تم اس کو یہ قرضہ اتارنے کے لیے دس روپے کا نوٹ دیتے ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو چاندی کے روپے ہی لوں گا اسے دس کا نوٹ ضرور لینا پڑے گا۔

روپیہ ایسا ہونا چاہیے کہ آسانی سے پاس رکھا جا سکے۔ چاندی کے سکوں میں یہ خوبی ایک حد تک پائی جاتی ہے۔ تاہم چاندی کے سکے وزنی ہوتے ہیں اسی (۸۰) روپے کا وزن سیر بھر ہو جاتا ہے تو جہاں پانچ چھ سو روپے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہوں وہاں اچھی خاصی دقت پیش آتی ہے۔

نوٹوں سے یہ دقت رفع ہو جاتی ہے۔ ہزاروں روپے کے نوٹ ایک جیب میں آسانی سے ڈالے جا سکتے ہیں۔ نوٹوں کے جاری کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

باوجود ان سب باتوں کے جس شخص کے پاس بہت سا روپیہ ہو۔ اس کے لئے یہ مشکل ہے کہ بہت سے نوٹ، کچھ روپے، چونیاں، دونیاں، یہ سب کچھ اپنے پاس سنبھال رکھے۔ ایک تو سنبھالنے کی تکلیف، دوسرے چوری کا خطرہ، اس لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا

روپیہ بینک میں رکھوا دے۔

بینک میں روپیہ امانت کے طور پر رہتا ہے' روپے کا مالک جب چاہے اس کو نکلوا سکتا ہے یا جس کو چاہے اپنے حصے کا روپیہ دلوا سکتا ہے کسی اور کو اپنے حصے کا روپیہ دلوانے کی ترکیب یہ ہے کہ اس کو چیک لکھ کر دے دیا جائے۔

ہم یہاں چیک کے معنوں کو واضح طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو عبداللہ نے بینک میں بہت سا روپیہ جمع کر رکھا ہے۔ کریم خاں اس سے دس روپے مانگنے آتا ہے۔ عبداللہ بجائے اس کے کہ کریم خاں کو دس روپے نقد دے وہ اسے دس روپے کا چیک لکھ دیتا ہے چیک گویا ایک قسم کا رقعہ ہے جو عبداللہ کریم خاں کی معرفت اپنے بینک کو بھیج رہا ہے۔ چیک پر مفصلہ ذیل الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔

بنام فلاں بینک

کریم خاں کو دس روپے دے دو

راقم عبداللہ

کریم خاں کی بجائے عبداللہ اگر کسی اور کا نام لکھ دے تو جس کا نام لکھے گا' اسی کو روپے ملیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کریم خاں دس روپوں کی بجائے دس روپے کا چیک کیوں قبول کر لیتا ہے؟ اس لئے کہ اسے عبداللہ پر اعتبار ہے وہ جانتا ہے کہ بینک میں ضرور عبداللہ کا روپیہ جمع ہوگا۔ میں جب یہ چیک لے جاؤں گا مجھے روپیہ ضرور مل جائے گا۔

اب فرض کرو کہ کریم خاں وہ چیک لے کے عبداللہ کے بینک میں گیا اور کہا کہ مجھے اس چیک کا روپیہ ادا کر دو۔ بینک والوں نے عبداللہ کا حساب دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں تو کل تین روپے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ چیک ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ انکار کر دیں گے اور کریم خاں کا عبداللہ پر اعتبار باقی نہ رہے گا۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بینک میں تو عبداللہ کو جانتے ہیں۔ مدت سے اس کا حساب کھلا ہوا ہے وہ کہتے ہیں بینک میں عبداللہ کے تین روپے ہیں مگر چلو فی الحال ہم باقی سات روپے اپنے پاس سے دے دیتے ہیں اور عبداللہ کی لاج رکھ لیتے ہیں۔ ہم یہ سات روپے پھر اس سے لے لیں گے لیکن عام طور پر ایسا کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لوگوں کا جتنا روپیہ بینک میں ہوتا ہے اس کے اندر اندر ہی

چیک دیتے ہیں اور کم ہی ایسا موقع پیش آتا ہے کہ بینک چیک ادا کرنے سے انکار کردے۔

اگر کریم خاں نے خود بھی کسی بینک میں حساب کھول رکھا ہے تو ضروری نہیں کہ عبداللہ کا چیک لے کر وہ خود عبداللہ کے بینک میں جائے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح وہ اپنا روپیہ بینک میں جمع ہونے کے لئے بھجوا دیتا ہے اسی طرح یہ چیک بھی بھجوا دے۔ اس کے بینک والے خود ہی عبداللہ کے بینک سے اس چیک کا روپیہ وصول کرلیں گے۔ یہ دس روپے کی رقم کریم خاں کے حساب میں جمع کردی جائے گی اور عبداللہ کے حساب میں خرچ کی آمد میں چڑھادی جائے گی۔

اس طرح یہ سہولت ہوئی کہ عبداللہ اور کریم خاں دونوں کا روپیہ اپنے اپنے بینک میں محفوظ پڑا ہے' نہ تو عبداللہ کو روپیہ ادا کرتے وقت نہ کریم خاں کو وصول کرتے وقت بینک جانا پڑا۔ وہ روپیہ ایک حساب میں سے نکل کر دوسرے کے حساب میں جمع بھی ہوگیا۔ یہ سب کچھ ایک چیک کی بدولت ظہور میں آیا۔

یہاں ہم نے صرف ''کاغذی روپے'' کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے' ایک سرکاری نوٹ اور دوسرے چیک' ان کے علاوہ اور بھی کاغذات ایسے ہیں جن کے ذریعے سے بڑی بڑی رقمیں یہاں سے دور دراز ملکوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

☆☆☆

فرہنگ

کھن کھن: سکوں کے گرنے یا گننے کی آواز۔ عند المطالبہ: مانگنے کے وقت، طلب کئے جانے پر، عند الطلب۔ روپے بھنا: بڑا نوٹ یا سکہ دے کر چھوٹے نوٹ یا سکے لینا۔

رونا رُلانا

ایک امریکن ادبی نقاد ایک مقام پر لکھتا ہے کہ ہر مرد ایک ہنسوڑا جانور ہے اور عورت ایک ایسا حیوان ہے جو اکثر رونی شکل بنائے رہتا ہے۔

مصنف کی خوش طبعی نے اس فقرے میں مبالغے اور تلخی کی آمیزش کر دی ہے اور چونکہ وہ خود مرد ہے اس لیے شاید عورتوں کو اس سے کلی اتفاق بھی نہ ہو لیکن بہر حال موضوع ایسا ہے جس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

میرے ایک دوست کا مشاہدہ ہے کہ عورتوں کی باہمی گفتگو یا خط و کتابت میں موت یا بیماری کی خبروں کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسے واقعات کے بیان کرنے میں عورتیں غیر معمولی تفصیل اور رقت انگیزی سے کام لیتی ہیں۔ گویا ناگوار باتوں کو ناگوار ترین پیرائے میں بیان کرنا ان کا نہایت پسندیدہ شغل ہے۔ ان سے وہ کبھی سیر نہیں ہوتیں۔ ایک ہی موت کی خبر کے لیے اپنی شناساؤں میں سے زیادہ سے زیادہ سامعین کی تعداد ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہیں۔ ایسی خبر جب بھی نئے سرے سے سنانا شروع کرتی ہیں۔ ایک نہ ایک تفصیل کا اضافہ کر دیتی ہیں اور ہر بار نئے سرے سے آنسو بہاتی ہیں اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ موت یا بیماری کسی قریبی عزیز کی ہو۔ کوئی پڑوسی ہو، ملازم ہو، ملازم کے ننھیال یا سہیلی کے سسرال کا واقعہ ہو، گلی میں روزمرہ آنے جانے والے کسی خوانچہ والے کا بچہ بیمار ہو، کوئی اڑتی اڑاتی خبر ہو، کوئی افواہ ہو۔ غرضیکہ اس ہمدردی کا حلقہ بہت وسیع ہے۔

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

نہ صرف یہ بلکہ رقت انگیز کہانیوں کے پڑھنے کا شوق عورتوں ہی کو بہت زیادہ ہوتا

ہے اور اس بارے میں سبھی اقوام کا ایک ہی سا حال ہے۔ غیر ممالک میں بھی رُلانے والی کہانیاں ہمیشہ نچلے طبقہ کی عورتوں میں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ گھٹیا درجے کے غم نگار مصنفین کو اپنی کتابوں کی قیمت اکثر عورتوں کی جیب سے وصول ہوتی ہے۔ وہ بھی عورتوں کی فطرت کو سمجھتے ہیں۔ کہانی کیسی ہی ہو اگر اس کا ہر صفحہ غم والم کی ایک تصویر ہے تو اس کی اشاعت یقینی ہے اور عورتوں کی آنکھوں سے آنسو نکلوانے کے لیے ایسے مصنفین طرح طرح کی ترکیبیں کرتے ہیں۔ کبھی ایک پھول سے بچے کو سات آٹھ سال کی عمر میں ہی مار دیتے ہیں اور بستر مرگ پر توتلی باتیں کرواتے ہیں۔ کبھی کسی یتیم کو رات کے بارہ بجے سردی کے موسم میں کسی چوک میں بھوکا اور ننگا کھڑا کر دیتے ہیں اور بھی رقت دلانی ہو تو اسے سید بنا دیتے ہیں۔ یہ بھی کافی نہ ہو تو اسے بھیک مانگتا ہوا دکھا دیتے ہیں کہ ”میری بوڑھی ماں مر رہی ہے۔ دوا کے لیے پیسے نہیں‘ خدا کے نام پر کچھ دیتے جاؤ۔“ کبھی کسی سگھڑ خوبصورت نیک طینت لڑکی کو چڑیل سی ساس کے حوالے کرا دیا یا کسی بدقماش خاوند کے سپرد کر دیا اور کچھ بس نہ چلا تو سوتیلی ماں کی گود میں ڈال دیا اور وہاں دل کی بھڑاس نکال لی۔ پڑھنے والی ہیں کہ زار وقطار رو رہی ہیں اور بار بار پڑھتی ہیں اور بار بار روتی ہیں۔

خود عورتوں کی تصنیفات اکثر ہچکیوں میں لپٹی ہوئی اور آنسوؤں میں لتھڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں جو کتابیں عورتوں نے لکھیں۔ اکثر میں نزع‘ بیماری‘ دق‘ سل‘ خودکشی‘ زہر‘ ظلم وتشدد ایک نہ ایک چیز کا سماں باندھ دینا گویا فرض جانا۔ ہاں کوئی کروشیا یا کھانا پکانے کی کتاب ہو تو اور بات ہے۔

آخر یہ مصیبت کیا ہے؟ یہ بات بات پر صف ماتم بچھ جانا کیا معنی؟ بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس امریکن نقاد نے کیا غلط کہا؟ جل کے کہا سہی لیکن بری بات کیا کہی؟

کسی گھر میں موت واقع ہو جائے تو زنانے اور مردانے کا مقابلہ کیجیے۔ مردوں کا ماتم تو صاف دکھائی دیتا ہے۔ بیچارے گھر کے باہر بیٹھے ہیں۔ سر نیچا کیے چپ چاپ آنکھیں کچھ سرخ ہیں۔ کبھی کبھی آنسو بھی ٹپک پڑتے ہیں یا کسی نہ کسی انتظام میں مصروف ہیں۔ چہرے پر تھکن اور اداسی سی ہے اور قدم ذرا آہستہ آہستہ اٹھتے ہیں اور زنانے کا ماتم تو دور دور سے موت کے گھر کا پتہ دیتا ہے اور جب کوئی نئی فلاں بی بی ڈولی سے اتر کر اندر جاتی

ہے تو ماتم کی بھنبھناہٹ میں از سر نو ایک لہر اٹھتی ہے جیسے یک لخت کوئی ہوائی جہاز پر سے گر پڑے۔ مرد تو دوسرے تیسرے دن کام میں مشغول ہو جاتے ہیں لیکن عورتوں کے ہاں مہینہ بھر کو ایک کلب قائم ہو جاتی ہے۔ گلوریوں پر گلوریاں کھائی جاتی ہیں اور چینخوں پر چینخیں ماری جاتی ہیں۔

کہیں بیمار پرسی کو جاتی ہیں تو بیمار میں وہ وہ بیماریاں نکال کے آتی ہیں جو ڈاکٹر کے وہم و گمان میں نہ تھیں۔ جتنی دیر سرہانے بیٹھی رہیں بیمار کی ہر کروٹ پر ہاتھ ملتی ہیں۔ بے چارہ کہیں گلا صاف کرنے کو بھی کھانسے تو یہ سورۃ یٰسین تک پڑھ جاتی ہیں۔ رنگ کی زردی' بدن کی کمزوری' سانس کی بے قاعدگی' ہونٹوں کی خشکی ہر بات کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیمار کو بھی اپنی یہ خطرناک حالت دیکھ کر چار و ناچار منحنی آواز میں بولنا پڑتا ہے۔ جوں جوں بیمار پرس عورتوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے موت قریب آتی جاتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ بعض عورتوں کو مریض کے بچ جانے پر صدمہ ہوتا ہوگا کہ اتنی تو بیمار پرسی کی اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

عورتیں نہ صرف دوسروں کے غم میں مزے لے لے کر روتی ہیں بلکہ دوسروں کی اشک باری کے لیے خود بھی سامان مہیا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتیں۔ ایک پرانے زمانے کے بزرگ اپنی اہلیہ کے متعلق فرمایا کرتے ہیں کہ ہماری گھر والی بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں کہ کوئی پڑوسن آ کے کہہ دے! کہ اے بُوا! ماشاء اللہ آج تو تمہارے چہرے پر رونق برس رہی ہے تو جھنجھلا کر بول اٹھتی ہیں کہ تیرے دیدوں میں خاک۔ میں تو مری جاتی ہوں اور میرا برا چاہنے والوں کو ابھی میں ہٹی کٹی نظر آتی ہوں اور کوئی آ کے کہہ دے کہ اے ہے بیٹی! تجھے کیا ہو گیا تو تو دن بدن گھلتی جاتی ہے نہ جانے تجھے کیا غم کھا گیا؟ تو ایسی پڑوسن کو فوراً خالہ کا لقب مل جاتا تھا۔ بڑی خاطر تواضع ہوتی تھی گھر کا کام کاج چھوڑ کر شام تک ان کو اپنے دکھڑے سنائے جاتے تھے اور چلتے وقت وہ پانچ روپے قرض بھی لے جایا کرتی تھیں جن کی ادائیگی کے لیے کبھی تقاضا نہ کیا جاتا تھا۔

اپنے اوپر رحم دلانے کا مرض جس کسی میں بھی پایا جائے۔ بہت ذلیل مرض ہے لیکن عورتوں میں یہ اس قدر عام ہے کہ خوش حال گھرانے کی بہو بیٹیاں بھی گفتگو میں چاشنی پیدا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی دکھ وضع کر لیتی ہیں اور موقع بے موقع سنا کر داد لیتی ہیں۔

اس تحریر سے میرا مطلب ان بہنوں کا مذاق اڑانا ہرگز نہیں جو جوفی الواقع غمگین یا مصیبت زدہ ہیں۔ان کی ہنسی اڑانا پرلے درجے کی شقاوت ہے جو خدا مجھے نصیب نہ کرے۔ کسی کا غم ایسی بات نہیں جو دوسرے کی خوش طبعی کا موضوع بنے۔صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زندگی کا بہت سا دکھ ضبط وتحمل اور خندہ پیشانی سے دور ہوسکتا ہے کسی مصیبت زدہ شخص کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ اس کا غم غلط کرایا جائے' کسی بیمار کی سب سے بڑی تیمارداری یہ ہے کہ اس کی طبیعت کو شگفتہ کرنے کا سامان پیدا کیا جائے۔غم کو برداشت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو ضبط کرنے کی کوشش کی جائے۔مہذب شخص کی یہی پہچان ہے اپنے دکھ کے قصے کو بار بار دہرا کر کسی دوسرے شخص کو متاثر کرنے کی کوشش کرنا گویا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے خود بھی ہنسو' اوروں کو بھی ہنساؤ۔دنیا میں غم کافی سے زیادہ ہے اس کو کم کرنے کی کوشش کرو۔ہنسنا اور خوش رہنا دماغ اور جسم کی صحت کی نشانی ہے۔غم نگار مصنفین کو میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ شخص انمول ہے جو اپنی تحریر سے ہزارہا لوگوں کو خوش کر دیتا ہے اور وہ شخص خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا جو اپنے زورِ قلم سے ہزارہا جوان' معصوم' خوش مزاج عورتوں اور مردوں کو رلاتا ہے اور رلاتا بھی اس طرح ہے کہ نہ اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے نہ کوئی دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے اور ہزار قابلِ افسوس ہے وہ شخص جو یہ سب کچھ کرکے بھی اپنی انشاپردازی پر ناز کرتا ہے۔

☆☆☆

فرہنگ (رونا رلانا)

طینت: سرشت، طبیعت، خو، عادت، خصلت۔ نزع: جان کنی، دم ٹوٹنا، آخری وقت۔ دق: ایک بیماری جو پھیپھڑوں کے خراب ہونے سے لگ جاتی ہے۔ سل: ایک بیماری جس سے پھیپھڑوں میں زخم ہو جاتے ہیں اور منہ سے خون آنے لگتا ہے۔ شقاوت: بدبختی، بدنصیبی، بدمعاشی، سنگدل۔ تزکیہ نفس: نفس کو پاک کرنا۔

اخبار میں ضرورت ہے

یہ ایک اشتہار ہے لیکن چونکہ عام اشتہار بازوں سے بہت زیادہ طویل ہے اس لیے شروع ہی میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوا ورنہ شاید آپ پہچاننے نہ پاتے۔

میں اشتہار دینے والا ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ چند دن سے ہمارا ایک چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخباروں میں نکل رہا ہے کہ ہمیں مترجم اور ایڈیٹر کی ضرورت ہے یہ غالباً آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ اس کے جواب میں کئی اُمیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض کو تنخواہ وغیرہ چکانے کے بعد ملازم بھی رکھ لیا گیا لیکن ان میں سے کوئی بھی ہفتے دو ہفتے سے زیادہ ٹھہرنے نہ پایا۔ آتے کے ساتھ ہی یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور سمجھتے تھے ہمارا مطلب کچھ اور تھا' مختصر سے اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا۔ جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا یا ان کی غلط توقعات ہم پر روشن ہوئیں تو تعلقات کشیدہ ہوئے۔ تلخ کلامی اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد تو وہ خود ہی ناشائستہ باتیں ہمارے منہ پر کہہ کر چائے والے کا بل ادا کیے بغیر چل دیے یا ہم نے ان کو دھکے مار کر باہر نکال دیا اور وہ باہر کھڑے نعرے لگایا کیے۔ جس پر ہماری اہلیہ نے ہم کو احتیاطاً دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر لیڈر ہی کے شائع کرنا پڑا۔ چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا اس لیے ضروری معلوم ہوا اگر ہم اپنے مختصر اور مجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے اس کے بعد جس کا دل چاہے' ہماری طرف رجوع کرے جس کا دل نہ چاہے وہ بے شک کوئی پریس الاٹ کرا

کے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔

اُمیدوار کے لیے سب سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ وہ کام چور نہ ہو۔ایک نوجوان کو ہم نے شروع میں ترجمے کا کام دیا۔چار دن کے بعد اس سے ایک نوٹ لکھنے کو کہا تو بھڑ کر بولے کہ میں مترجم ہوں۔سب ایڈیٹر نہیں ہوں ایک دوسرے صاحب کو ترجمے کے لیے کہا تو بولے میں سب ایڈیٹر ہوں۔مترجم نہیں ہوں ہم سمجھ گئے کہ یہ ناتجربے کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر کو الگ الگ دو آدمی سمجھتے ہیں۔حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں ہم سے بگڑنے لگے کہ آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔دوسرے صاحب کہنے لگے آپ کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط ہے۔ایک تیسرے صاحب نے ہمارے ایمان اور ہمارے صرف ونحو دونوں پر فحش حملے کیے۔اس لئے ہم واضح کیے دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہم کو ہرگز ضرورت نہیں جو ایک سے دوسرا کام کرنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور اس کے لیے صرف ونحو کی آڑ لیتے ہیں۔ہمارے ہاں جو ملازم ہوں گے انہیں تو وقتاً فوقتاً ساتھ کی دکان سے پان بھی لانے پڑیں گے اور اگر انہیں بحث ہی کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب ایڈیٹر کے معنی یہ ہیں۔ایڈیٹر کا اسم مخفف' اخبار میں ایک عہدہ دار کا نام جو ایڈیٹر کو پان وغیرہ لا کر دیتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا اخبار زنانہ اخبار نہیں۔لہٰذا کوئی خاتون ملازمت کی کوشش نہ فرمائیں۔پہلے خیال تھا کہ اشتہار میں اس بات کو صاف کر دیا جائے اور لکھ دیا جائے کہ مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو مرد ہوں لیکن پھر خیال آیا کہ لوگ مرد کے معنی شاید جوانمرد سمجھیں اور اہل قلم کی بجائے طرح طرح کے پہلوان نیشنل گارڈ والے اور مجاہد پٹھان ہمارے دفتر کا رخ کریں پھر یہ بھی خیال تھا کہ آخر عورتیں کیوں آئیں گی مردوں کی ایسی بھی کیا قلت ہے۔لیکن ایک دن ایک خاتون آ ہی گئیں۔پرزے پر نام لکھ کر بھیجا ہمیں معلوم ہوتا کہ عورت ہے تو بلاتے ہی کیوں؟ لیکن آج کل کم بخت نام سے تو پتہ ہی نہیں چلتا۔فاطمہ' زبیدہ اور عائشہ کچھ نام ہوتا تو میں غسل خانے کے رستے باہر نکل جاتا لیکن وہاں تو نازجہا نجھروی یا عندلیب گلستانی یا کچھ ایسا ہی فلمی نام تھا۔آج کل لوگ نام بھی تو عجیب عجیب رکھ لیتے ہیں۔غلام رسول' احمد دین اور مولا دادا ایسے لوگ تو ناپید ہی ہو گئے

ہیں۔ جسے دیکھیے نظامی گنجوی اور سعدی شیرازی بنا پھرتا ہے۔ اب تو اس پر بھی شبہ ہونے لگا کہ حرارت غریزی' نزلہ کھانسی' ثعلب مصری ادیبوں ہی کے نام نہ ہوں۔ عورت مرد کی تمیز تو کوئی کیا کرے گا۔ بہرحال ہم نے اندر بلایا تو دیکھا کہ عورت ہے۔ دیکھا کے یہ معنی ہیں کہ ان کا برقعہ دیکھا اور حسن ظن سے کام لے کر اندازہ لگایا کہ اس کے اندر عورت ہے۔ ہم نے بصد ادب و احترام کہا کہ ہم خواتین کو ملازم نہیں رکھتے انہوں نے وجہ پوچھی ہم نے کہا پیچیدگیاں' کہنے لگیں آگے بولیں ہم نے کہا پیدا ہوتی ہے۔ بھڑک کر بولیں کہ آپ بھی تو عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ اس امر کا ہماری سوانح عمری میں کہیں ذکر نہیں۔ اس لیے ہم تائید یا تردید کچھ نہ کر سکے۔ میری ولادت کو انہوں نے اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ بہتیرا سمجھایا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور بہرحال میری ولادت کو آپ کی ملازمت سے کیا تعلق؟ اور یہ تو آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں۔ اگر ہمارے پروپرائٹر سے کہیں تو وہ آپ کی اور میری ہم دونوں کی ولادت کے متعلق وہ وہ نظریئے بیان کریں کہ آپ ہکا بکا رہ جائیں۔ خدا خدا کر کے پیچھا چھوٹا۔

ہمارے اخبار میں پروپرائٹر کا احترام سب سے مقدم ہے۔ وہ شہر کے ایک معزز ڈپو ہولڈر ہیں۔ اخبار انہوں نے محض خدمت خلق اور رفاہ عام کے لیے جاری کیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ پبلک ان کی شخصیت اور مشاغل سے ہر وقت باخبر رہے چنانچہ ان کے پوتے کا ختنہ ان کے ماموں کا انتقال ان کے صاحبزادے کی میٹریکولیشن میں حیرت انگیز کامیابی (حیرت انگیز ان معنوں میں کہ پہلے ہی ریلے میں پاس ہو گئے) ایسے واقعات سے پبلک کو مطلع کرنا ہر سب ایڈیٹر کا فرض ہو گا نیز ہر اس پریس کانفرنس میں جہاں خورد و نوش کا انتظام بھی ہو ہمارے پروپرائٹر مع اپنے دو چھوٹے بچوں کے جن میں سے لڑکے کی عمر سات سال اور لڑکی کی پانچ سال ہے' شریک ہوں گے اور بچے فوٹو میں شامل ہوں گے اور اس پر کسی سب ایڈیٹر کو زیر لب فقرے کہنے کی اجازت نہ ہو گی۔ یہ بچے بہت ہی ہونہار ہیں اور حالات حاضرہ میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں۔ کشمیر کے متعلق پریس کانفرنس ہوئی تو چھوٹی بچی ہندوستانیوں کی ریشہ دوانیوں کا حال سن کر اتنے زور سے روئی کہ خود سردار ابراہیم اسے گود میں لیے پھرے تو کہیں اس کی طبیعت سنبھلی۔

ہمارے اخبار کا نام "آسمان" ہے۔ پیشانی پر یہ مصرعہ مندرج ہے کہ آسمان بادل کا پہلے خرقہ دیرینہ ہے۔ اس فقرے کو ہٹانے کی کوئی سب ایڈیٹر کوشش نہ فرمائیں کیونکہ یہ خود ہمارے پروپرائٹر صاحب کا انتخاب ہے۔ ہم نے شروع شروع میں ان سے پوچھا بھی تھا کہ صاحب اس مصرعے کا اخبار سے کیا تعلق ہے؟ کہنے لگے اخبار کا نام آسمان ہے اور اس مصرعے میں بھی آسمان کرتا ہے ہم نے کہا بجا لیکن خاص اس مصرعے میں کیا خوبی ہے؟ کہنے لگے علامہ اقبال کا مصرعہ ہے اور علامہ اقبال سے بڑھ کر شاعر اور کون ہے۔ اس پر ہم چپ ہو گئے۔ پیشانی پر اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار بھی لکھا ہے یہ میرا تجویز کیا ہوا ہے اسے بھی بدلنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ عمر بھر کی عادت ہے ہم نے جہاں جہاں ایڈیٹری کی اپنے اخبار کی پیشانی پر یہ ضرور لکھا۔

بعض امیدوار ایسے بھی آتے ہیں کہ آتے ہی ساتھ ہی ہمیں سے سوالات پوچھنے لگتے ہیں۔ ایک سوال بار بار دہراتے ہیں کہ آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہے۔ جیسے کوئی پوچھے کہ آپ کی ذات کیا ہے۔ ہماری پالیسی میں چند باتیں تو مستقل طور پر شامل ہیں مثلاً ہم عربوں کے حامی ہیں اور امریکہ سے ہرگز نہیں ڈرتے۔ چنانچہ ایک دن ہم نے پریذیڈیٹ ٹرومین کے نام اپنے اخبار میں ایک کھلی چٹھی بھی شائع کر دی لیکن عام طور پر ہم پالیسی میں جمود کے قائل ہیں۔ اسی لیے سب ایڈیٹر کو ہم سے ہدایات لینی پڑیں گی۔ ہفتہ رواں میں ہماری پالیسی یہ ہے کہ پنڈی گھیپ کے ہیڈ ماسٹر کو موسم سرما سے پہلے پہل یا ترقی دلوائی جائے یا ان کا تبادلہ لاہور کیا جائے۔ ان کے لڑکے کی شادی ہمارے پروپرائٹر کی لڑکی سے طے پا چکی ہے اور خیال ہے کہ موسم سرما میں شادی کر دی جائے۔

انشاء کے متعلق ہمارا خاص طرز عمل ہے اور ہر سب ایڈیٹر اور مترجم کو اس کی مشق بہم پہنچانی پڑے گی۔ مثلاً پاکستان بنا نہیں معرض وجود میں آیا ہے۔ ہوائی جہاز اڑتا نہیں محو پرواز ہوتا ہے۔ مترجموں کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑے گا۔ ایک مترجم نے لکھا کہ کل مال روڑ پر دو موٹروں کی ٹکر ہوئی اور تین آدمی مر گئے۔ حالانکہ انہیں کہنا چاہیے تھا کہ دو موٹروں کے تصادم کا حادثہ رونما ہوا جس کے نتیجے کے طور پر چند اشخاص جن کی تعداد تین بتائی جاتی ہے مہلک طور پر مجروح ہوئے۔

لاہور کارپوریشن نے اعلان کیا کہ فلاں تاریخ سے ہر پالتو کتے کے گلے میں پیتل کی ایک ٹکیہ لٹکانی ضروری ہے جس پر کمیٹی کا نمبر لکھا ہوگا۔ایک مترجم نے یہ ترجمہ یوں کیا کہ ہر کتے کے گلے میں بِلا ہونا چاہیے۔حالانکہ کارپوریشن کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ ایک جانور کے گلے میں ایک دوسرا جانور لٹکا دیا جائے۔

سینما کے فری پاس سب ایڈیٹر کے مشاہرے میں شامل نہیں۔یہ پاس ایڈیٹر کے نام آتے ہیں اور وہی ان کو استعمال کرنے کا مجاز ہے۔فی الحال یہ پروپرائٹر اور ان کے اہل خانہ کے کام آتے ہیں لیکن عنقریب اس بارے میں سینما والوں سے ایک نیا سمجھوتہ ہونے والا ہے۔اگر کوئی سب ایڈیٹر اپنی تحریر کے زور سے سینما والے سے پاس حاصل کرے تو وہ اس کا اپنا حق ہے لیکن اس بارے میں ایڈیٹر کے ساتھ کوئی مفاہمت کر لی جائے تو بہتر ہوگا۔علی ہذا جو خانہ کے لیے آتی ہے۔مثلاً بالوں کا تیل' عطریات' صابن' ہاضم دوائیاں وغیرہ وغیرہ ان کے بارے میں بھی ایڈیٹر سے تصفیہ کر لینا ہر سب ایڈیٹر کا اخلاقی فرض ہوگا۔

ممکن ہے ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ہمارے ہاں ملازمت کرنے کو تیار نہ ہو' اس کا امکان ضرور موجود ہے لیکن ہمارے لیے یہ چنداں پریشانی کا باعث نہ ہوگا۔ہمارے پروپرائٹر آگے ہی دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ سٹاف بہت بڑھ رہا ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ہماری ترقی بھی روک دی ہے عجب نہیں کہ جب ہم دفتر میں اکیلے رہ جائیں تو وہ ہمیں ترقی دینے پر آمادہ ہو جائیں وہ اصولاً سٹاف بڑھانے کے خلاف ہمیں دانشمندانہ انداز میں کہتے ہیں کہ سٹاف زیادہ ہو تو بات باہر نکل جاتی ہے۔یہ معلوم کبھی نہیں ہوا کہ آخر کیا بات؟ کون سی بات؟ اپنے ڈپو پر بھی وہ اکیلے ہی کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ ورنہ بات باہر نکل جاتی ہے۔

☆☆☆

فرہنگ

عطف: پھیرنا، موڑنا، مہربانی، کسی کلمے یا کلام کو دوسرے کلمے یا کلام کی طرف پھیرنا، وہ حرف جو دو لفظوں یا دو کلموں کو ملائے جیسے اور یا و وغیرہ۔ غریزی: طبعی، فطری، حقیقی۔ ثعلب مصری: ایک درخت کی جڑ جو لومڑی کے خصیے کے مشابہ ہے اور اطباء نے اسے مغلظ و مبہی لکھا ہے۔ ریشہ دوانیوں: ریشہ دوانی کی جمع، شرارتیں، فسادات، سازشیں، جوڑ توڑ۔ مُشاہرے: مشاہرہ، ماہوار تنخواہ، طلب وظیفہ، جمع مشاہرات۔ علیٰ ہذا: اسی طرح۔

''تہذیب'' کے چند مستقل عنوانات پر ایک مرد کے قلم سے مضامین

(از پطرس)

دستکاری

(فٹ بال کھیلنے کے لیے نیکر کی لیس)

ذیل میں ایک نہایت خوبصورت لیس کی ترکیب لکھتا ہوں۔ جو زری کے تاروں میں بنا کر نیکر میں لگائی جا سکتی ہے۔

لیس بنانے کی ترکیب ذیل میں درج ہے۔

ترکیب: سب سے پہلے بیس چین بنالو۔اس کے بعد چھ قید خانے بنالو۔

دوسری قطار: پانچ چین زائد لو' تیسرے چین کے ساتھ ایک جاپان زائد کرو۔

چوتھی قطار: اب ج ذ د بھ پھ تھ' ا د ق' د و ح ق' ہ و ح ق

دستر خوان پر

(پالک کے ساگ کا مربا)

کسی بھائی نے پالک کے ساگ کا مربا بنانے کی ترکیب پوچھی ہے۔ اس کی ترکیب بہت آسان ہے۔ پہلے ساگ کو گندھک کے تیزاب میں دھولو۔ پھر ایک ایک پتا الگ

الگ کر کے کسی رسی پر سکھانے کے لئے لٹکا دو۔ پھر سب کو ایک جگہ جمع کر کے حسب منشاء اس پر شیرہ چھڑکو۔ یہ احتیاط ضرور کرنی چاہیے کہ شیرہ ساگ کے اردگرد فرش پر نہ گرے۔ اب لمبی لمبی میخوں والے جوتے پہن کر اس پر کودو جب ذرا گداز ہو جائے تو کسی بڑے دیگچے میں ڈال کر ہلکی ہلکی آگ پر سات مہینے تک پکاؤ۔ اس کے بعد اگر دل چاہے تو ہوائی پستہ کاٹ کر ڈال دو۔

مربا اب بالکل تیار ہے۔ چھوٹی چھوٹی پلیٹوں میں ڈال کر دوستوں کو کھلاؤ۔

محفل تہذیب

میں نہایت خوشی کے ساتھ لکھتا ہوں کہ خدا نے میرے تایا منشی تقصیر صادق صاحب کے گھر ایک چاند سا بچہ عطا فرمایا ہے۔ کوئی صاحب قطعہ تہنیت کہنے کی تکلیف گوارا نہ کریں۔ زچہ اور بچہ اور پہلے بارہ لڑکے خدا کے فضل سے بخیریت ہیں۔ بچے کا نام اخیر صادق رکھا گیا ہے۔

☆

میں نہایت مسرت کے ساتھ قارئین تہذیب کو اطلاع دیتا ہوں کہ میرے پیارے بھائی نے نو سال کے بعد ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا ہے اور ان کے ایک ہم جماعت طالب علم نے جو فیل ہو گیا ہے۔ خاص طور پر ان کو مبارکباد کا پیغام بھیجا ہے۔

☆

میری نئی قمیص پر شوربہ گر جانے سے بہت بدنما دھبے پڑ گئے ہیں۔ براہ مہربانی کوئی بھائی یا بہن مطلع فرمائیں کہ یہ کسی طرح دور کیے جائیں۔

☆

ایک ماہ تک بیمار رہ کر اب صحت یاب ہوا ہوں مگر اس علالت کی وجہ سے اِدھر میرے سر کے بال گرتے جاتے ہیں۔ ادھر ان کی جگہ اور بال پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ کوئی بھائی اس کا علاج بتائیں؟

☆

مجھے یہ نظم مکمل چاہیے جس کا ایک مصرعہ یہ ہے۔
میری پیاری اماں! میری جان اماں!

ولائتی معلومات

(خانہ داری کے اشارات)

سگرٹ پڑے پڑے پرانے ہو گئے ہیں تو انہیں اٹھا کر باہر پھینک دینا چاہیے۔

☆

بعض اوقات سگار میں سوراخ ہو جانے کی وجہ سے ٹھیک طرح کش نہیں لگایا جا سکتا۔ ایسے سوراخوں پر ڈاک خانے کے ٹکٹوں کا حاشیہ چپکا لینا چاہیے۔ جب حاشیہ اچھی طرح سوکھ جائے تو اس پر بیل بوٹے بنا لینے سے سگار اور بھی خوشنما معلوم ہونے لگتا ہے۔

☆

اگر چہرہ بہت میلا ہو گیا ہو تو گرم پانی میں صابن کی جھاگ ملا کر خوب صاف کیا جائے۔ چہرے کا رنگ نکھر جائے گا۔

(از پطرس)

☆☆☆

فرہنگ

تہنیت: مبارک باد، مبارک باد دینا یا لینا۔

اب اور تب

جب مرض بہت پرانا ہو جائے اور صحت یابی کی کوئی اُمید باقی نہ رہے تو زندگی کی تمام مسرتیں محدود ہو کر بس یہیں تک رہ جاتی ہیں کہ چارپائی کے سرہانے میز پر جو انگور کا خوشا رکھا ہے اس کے چند دانے کھا لیے' مہینے دو مہینے کے بعد کوٹھے پر غسل کر لیا یا گاہے گاہے ناخن ترشوا لیے۔

مجھے کالج کا مرض لاحق ہوئے اب کئی برس ہو چکے ہیں۔ شباب کا رنگین زمانہ امتحانوں میں جوابات لکھتے لکھتے گزر گیا اور اب زندگی کے جو دو چار دن باقی ہیں وہ سوالات مرتب کرتے کرتے گزر جائیں گے۔ ایم اے کا امتحان گویا مرض کا بحران تھا۔ یقین تھا کہ اس کے بعد یا مرض نہ رہے گا یا ہم نہ رہیں گے۔ سو مرض تو بدستور باقی ہے اور ہم ۔۔۔ ہر چند کہیں کہ ہیں ۔۔۔۔ نہیں ہیں۔ طالب علمی کا زمانہ بے فکری کا زمانہ تھا۔ نرم نرم گدیلوں پر گزرا گویا بستر عیش پر دراز تھا۔ اب تو صاحب فراش ہوں اب عیش صرف اس قدر نصیب ہے کہ انگور کھا لیا۔ غسل کر لیا ناخن ترشوا لیے۔

تمام تگ و دو لائبریری کے ایک کمرے اور سٹاف کے ایک ڈربے تک محدود ہے اور دونوں کے درمیان کا ہر موڑ ایک کمین گاہ معلوم ہوتا ہے۔

کبھی راوی سے بہت دلچسپی تھی۔ روزانہ علی الصباح اس کی تلاوت کیا کرتا تھا اب اس کے ایڈیٹر صاحب سے ملتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں سلام روستائی کھینچ ماریں گے۔ ہال میں سے گزرنا قیامت ہے وہم کا یہ حال ہے کہ ہر ستون کے پیچھے ایک ایڈیٹر چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

کالج کے جلسوں میں اپنی دریدہ دہنی سے بہت ہنگامہ آرائیاں کیں۔ صدر جلسہ بننے سے ہمیشہ گھبرایا کرتا ہوں کہ یہ ''دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ'' والا معاملہ ہے۔ اب جب کبھی جلسہ کا سن پاتا ہوں ایک خنک سا ضعف بدن پر طاری ہو جاتا ہے۔ جانتا ہوں کہ کرسی صدارت کی سولی پر چڑھنا ہوگا اور سولی بھی ایسی کہ ''انا الحق'' کا نعرہ نہیں لگا سکتا۔

قاضی صاحب قبلہ نے اگلے دن کالج میں ایک مشاعرہ کیا۔ مجھ سے بدگمانی اتنی کہ مجھے اپنے عین مقابل ایک نمایاں اور بلند مقام پر بٹھا دیا اور میری ہر حرکت پر نگاہ رکھی۔ میرے اردگرد محفل گرم تھی اور میں کنچن چنگا کی طرح اپنی بلندی پر جما بیٹھا تھا۔

جس دن کالج میں تعطیل ہوا کرتی مجھ پر اداسی سی چھا جاتی۔ جانتا کہ آج کے دن تہمد پوش، تولیہ بردار، صابن نواز ہستیاں دن کے بارہ ایک بجے تک نظر آتی رہیں گی۔ دن بھر لوگ گنے چوس چوس کر جا بجا پھوگ کے ڈھیر لگا دیں گے۔ جو رفتہ رفتہ آثار صنادید کا سا مٹیالہ رنگ اختیار کر لیں گے۔ جہاں کسی کو ایک کرسی اور سٹول میسر آ گیا وہیں کھانا منگوا لے گا اور کھانا کھا چکنے پر کوؤں اور چیلوں کی ایک بستی آباد کرتا جائے گا تاکہ دنیا میں نام برقرار رہے۔

اب یہ حال ہے کہ مہینوں سے چھٹی کی تاک میں رہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ اگر اس چھٹی کے دن بال نہ کٹوائے تو پھر بات گرمی کی تعطیلات پر جا پڑے گی۔ مرزا صاحب سے اپنی کتاب واپس نہ لایا تو وہ بلاتکلف ہضم کر جائیں گے۔ مچھلی کے شکار کو نہ گیا تو عمر بھر زندہ مچھلی دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔

اب تو دلچسپی کے لیے صرف یہ باتیں رہ گئی ہیں کہ فورتھ ائیر کی حاضری لگانے لگتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس دروازے کے پاس جو نوجوان سیاہ ٹوپی پہنے بیٹھے ہیں اور اس دروازے کے پاس جو نوجوان سفید پگڑی پہنے بیٹھے ہیں۔ حاضری ختم ہونے تک یہ دونوں جادو کی کرامات سے غائب ہو جائیں گے اور پھر ان میں سے ایک صاحب تو ہال میں نمودار ہوں گے اور دوسرے بھگت کی دکان میں دودھ پیتے دکھائی دیں گے۔ آج کل کے زمانے میں ایسی نظر بندی کا کھیل کم دیکھنے میں آتا ہے یا صاحبِ کمال کے کرتب کا تماشا کرتا ہوں جو عین لیکچر کے دوران میں کھانستا کھانستا یک لخت اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بیماروں کی طرح دروازے تک چل کر وہاں سے پھر ایسا بھاگتا ہے کہ پھر ہفتوں سراغ نہیں ملتا یا ان اہل فن کی

داد دیتا ہوں جو روزانہ دیر سے آتے ہیں اور یہ کہہ کر اپنی حاضری لگوا لیتے ہیں کہ صاحب غریب خانہ بہت دور ہے۔ جانتا ہوں کہ دولت خانہ ہوسٹل کی پہلی منزل پر ہے لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ میری بات پر یقین انہیں بھلا کیسے آئے گا اور کبھی ایک دو منٹ کو فرصت نصیب ہو تو دل بہلانے کے لیے یہ سوال کافی ہے کہ ہال کی گھڑی مینار کی گھڑی سے تین منٹ پیچھے ہے۔ دفتر کی گھڑی ہال کی گھڑی سے سات منٹ آگے ہے۔ چپڑاسی نے صبح دوسری گھنٹی مینار کے گھڑیال سے پانچ منٹ پہلے بجائی اور تیسری گھنٹی ہال کی گھڑی سے نو منٹ پہلے تو مرکب سود کے قاعدے سے حساب لگا کر بتاؤ کہ کس کا سر پھوڑا جائے۔

وہی میں نے کہا نا! کہ انگور کھالیا، غسل کر لیا اور ناخن ترشوا لیے۔

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی
اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

☆☆☆

فرہنگ

کمین گاہ: گھات کی جگہ، وہ جگہ جہاں چھپ کر شکار یا دشمن کو ماریں۔ رُوستائی: دہقان، دیہات کے رہنے والے، خوشامد کرنا۔ دریدہ: پھٹا ہوا، چیرا ہوا، شگاف دیا ہوا۔

تنزّل

مجھے نہیں معلوم میرا انجام کیا ہوگا؟ جس تیز روی سے میں تنزّل کی طرف جا رہا ہوں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دل و دماغ کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ مجھے خود بھی اس بات کا یقین ہے میں ہمیشہ سے اس کا قائل رہا ہوں۔ لیکن میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ میں مجبور ہوں میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ ایک زبردست کشش، ایک ہمہ گیر جاذبیت مجھے ہلاکت اور پستی کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔

آہ! بہت تھوڑے عرصہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے آپ کو ایک نہایت عالی مقام پاتا تھا۔ میرا مطمع نظر اور میرا دائرہ افق اس قدر وسیع تھا کہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے میرا دماغ چکر کھاتا تھا۔ مجھے صرف عالی نگاہ لوگ دیکھ سکتے تھے اور میں کوتاہ بینوں سے مامون تھا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ کسی اور کو تو کیا۔ میں خود اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت عرصہ گزرنے نہیں پائے گا جب میرے حیات فنا ہو جائیں گے۔ شاید میرے حواس مجھے جواب دے جائیں۔ میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مردوں سے بدتر ہوں کیونکہ جو شخص مر جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے تو لگ جاتا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ آرام اور سکون میرے لیے ناممکنات سے ہیں۔ نہ مجھے اس وقت کوئی ناصح مفید ہو سکتا ہے اور نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کر سکتا ہوں۔ چارہ گر کو مجھ پر رحم آ سکتا ہے لیکن اسے میرے نزدیک آنے کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔ زندگی میں یہ ایک —— صرف ایک لغزش کا نتیجہ ہے۔ آپ نہیں سمجھے؟ خوب! بات یہ ہے کہ میں جامع مسجد کے مینار سے گر رہا ہوں۔

فرہنگ

تنزّل: زوال، گھٹاؤ، کمی، تخفیف، اُتار، درجہ ٹوٹنا۔ مامون: محفوظ، بے خوف۔

براڈ کاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا ہے

کچھ عرصہ کا ذکر ہے کہ ایک دن اپنے دفتر میں ایک فائل کھولے بیٹھا تھا میرے سامنے موضع مریدپور کے ایک صاحب کا خط تھا جس میں انہوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ مریدپور میں بھی فوراً دس کیلوواٹ کا ریڈیو اسٹیشن کھولا جائے۔ ورنہ مریدپور کے ڈیڑھ سو باشندے سب کے سب ریڈیو کا بائیکاٹ کر دیں گے میں سوچ رہا تھا کہ جواب میں کیا لکھوں جس سے مجاہد کا جوش ٹھنڈا ہو جائے اور ریڈیو کا محکمہ اس کار عظیم سے بچ جائے جس کی وہ دھمکی دے رہے ہیں۔ اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکایک میرے سامنے دلی کے اسٹیشن ڈائریکٹر صاحب مسٹر لکھشمانن مع اپنی مونچھوں کے داخل ہوئے۔ میں سہم گیا میں طبعاً بہت ڈرپوک ہوں اور اسٹیشن ڈائریکٹروں سے تو میں بہت ہی ڈرتا ہوں کیونکہ صاحب جب ہمارے پاس آتے ہیں۔ ہزارہا سننے والوں کے وکیل بن کر آتے ہیں اور کوئی نئی تجویز پیش کرتے ہیں اس کی تمہید ہوتی ہے کہ "ہمارے ہزارہا سننے والے جن کی خوشنودی پر ہمارے محکمہ کی بہبود کا انحصار ہے کہتے ہیں کہ یوں ہو اور یوں نہ ہو۔" اس لیے جب بھی کوئی اسٹیشن ڈائریکٹر صاحب میرے کمرے میں داخل ہوں' مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہزاروں ریڈیو کے شائقین مجھ پر دھاوا بولنے والے ہیں اور پھر میں مسٹر لکھشمانن سے تو بہت خوف کھاتا ہوں کیونکہ وہ ہر وقت بغل میں چھوٹی سی چھڑی دبائے پھرتے ہیں جو مختصر مگر ہر لحاظ سے کارآمد معلوم ہوتی ہے۔

ان کی شکل دیکھتے ہی میں نے کہا "کہیے حضرت آپ کے ہزارہا سننے والے جن کی خوشنودی پر ہمارے محکمہ کی بہبود کا انحصار ہے آج کیا چاہتے ہیں۔" مسٹر لکھشمانن خلاف

توقع ہنس دیئے جس سے مجھے اطمینان ہوا اور کہنے لگے۔ "اب کے جو تجویز میں لایا ہوں اس میں سننے والوں کی مرضی کو کچھ دخل نہیں۔ جو تجویز میں آج لے کر آیا ہوں وہ میری اپنی ہے۔ بات یہ ہے کہ مجھ سے ایک حماقت ہو گئی ہے جس کا خمیازہ اب آپ کو بھگتنا ہوگا۔ ہم نے تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے جس میں باری باری مختلف قسم کے لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے وہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے کہا "مجھے تو یہ کچھ بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن خیر فرمایئے۔" کڑک کر بولے "آپ اکیلے کی رائے ہمارے ہزار ہا سننے والوں کے مقابلہ میں جن کی خوشنودی پر۔۔۔۔ خیر تو تقریروں کے اس سلسلے میں اب کے براڈ کاسٹر کی باری ہے اس لیے آپ اس مضمون پر تحریر کر دیجئے کہ براڈ کاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔" میں نے کہا "جہاں تک میں اندازہ لگا سکتا ہوں آپ کے ہزار ہا سننے والے جن کی خوشنودی پر محکمے کی بہبود کا وغیرہ وغیرہ ہے وہ تو براڈ کاسٹر کو ایک بے معنی سا انسان سمجھتے ہیں تو براڈ کاسٹر کا معنی رکھنا یعنی چہ معنی؟" اس پر وہ اس قدر بھڑ گئے کہ غصے کے مارے زبان میں لکنت آ گئی۔ "میں اپنے سننے والوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں ہوں ورنہ میں بھی آپ کو ایسی کھری کھری سناؤں گا کہ آپ سن کر رہ جائیں گے۔" میں نے کہا "اگر آپ حکیم کے مشورہ سے مجبور ہیں تو ایسی تقریر کے لیے تو مجھ سے کسی بڑے افسر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ جن کا کلام سند ہو اور جو تمام حالات پر ایک بلند نقطۂ نظر سے روشنی ڈال سکیں۔" کہنے لگے "تقریر ہندوستانی میں ہوگی اس لیے کسی بڑے افسر کو تکلیف دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔" میں نے کہا تو پھر جو ہونہار نوجوان ریڈیو اسٹیشن پر کام کرتے ہیں انہیں یہ تقریر کرنی چاہیے۔ وہ براڈ کاسٹنگ کی مشکلات کو بھی مجھ سے زیادہ جانتے ہیں اور اس کی مسرتوں کو بھی۔ میں تو یہاں دفتر میں بیٹھا ہوں فائلوں کی تلاوت میں مشغول رہتا ہوں یہاں نہ مائکروفون ہے نہ لاؤڈ اسپیکر نہ یہاں اہل علم کے قافلے آتے ہیں نہ اہل فن کے طائفے۔ اصل میں کشتی کے ملاح تو آپ لوگ ہیں جو آپ رات دن پروگرام وضع کرتے رہتے ہیں۔ میں یہاں کنارے پر بیٹھا ہوں میری تقریر میں وہ بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے جو آپ لوگوں کی تقریر میں ہوگی۔" اس پر مسٹر لکھشمانن بولے "ہم لوگوں کو آپ نے بیکار سمجھ رکھا ہے جو ہم تقریریں کرتے پھریں ہمیں ضروری کاموں ہی سے فرصت

کہاں۔"

یقین مانیئے اس سے مجھے بے انتہا ندامت ہوئی لیکن اسے میری طبیعت کی پستی کہہ لیں کہ یہ گوارانہ ہوا کہ اپنی بے کاری کا اعتراف کر کے تقریر کی ہامی بھرلوں چنانچہ میں نے پھر انکار کر دیا۔

مسٹر لکھشمانن یک لخت اٹھ کھڑے ہوئے۔ میری طرف قہر کی نظروں سے دیکھا اور اپنی چھڑی آسمان کی طرف اٹھا کر بولے۔ "اگر آپ یہ تقریر اپنے ذمہ نہ لیں گے تو میں۔۔۔تو میں۔"

اس کے بعد وہ لحہ بھر کو خاموش ہو گئے اور پھر دانت پیس کر بولے "اگر آپ یہ تقریر اپنے ذمہ نہ لیں گے تو میں اپنی مونچھیں منڈا ڈالوں گا۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے اور میں پھر موضع مرید پور کی بڑھتی ہوئی بے چینی پر غور کرنے لگا۔ دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ مسٹر لکھشمانن کی مونچھیں سچ مچ ندارد ہیں۔ وہ مونچھیں جن پر ٹرانسسٹر کے کھمبوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ مونچھیں جو دہلی کے مشہور اور قابل دید مقامات میں شمار ہوتی تھیں۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا میں نے دل میں سوچا جو ہونا تھا ہو چکا۔ مثل ہے کہ گئی مونچھ پھر ہاتھ آتی نہیں اور ایک اور مثل ہے کہ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں مونچھ۔ لیکن اگر اب بھی میں تقریر کرنے پر آمادہ ہو جاؤں تو کم از کم ان سے آنکھیں ملانے کے قابل تو ہو جاؤں گا' ورنہ مسٹر لکھشمانن کے باحمیت چہرے پر نظر پڑے گی تو دل چاہے گا جنگل میں دھونی رما کر بیٹھ جاؤں۔ چنانچہ میں نے دل کڑا کر کے ٹیلی فون پر ان سے کہا کہ حضرت میں تقریر کرنے کو تیار ہوں اور پھر جھٹ ٹیلی فون بند کر دیا تاکہ میری ہچکیوں اور سسکیوں کی آواز ان کے کانوں تک نہ پہنچے۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ مونچھیں منڈوانے کا میری تقریر سے کچھ تعلق نہ تھا۔ مسٹر لکھشمانن کی بیگم صاحبہ نے پہلے ہی حکم دے رکھا تھا کہ مونچھیں صاف کروای جائیں۔ تو بہر حال یہ وہ حالات ہیں جن کے ماتحت میں بن بلائے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اس لیے میں آپ کی سمع خراشی کے لیے نہ دل سے معافی مانگتا ہوں۔ میں اس صاحب ذوق سے معافی مانگتا ہوں جو مس ٹھمری بائی یا استاد خیال خاں کی آس میں ریڈیو کھولے بیٹھے تھے اور جن کے لیے میری تقریر سوہان روح ہو رہی ہے۔ ان

ہوٹل والوں سے معافی مانگتا ہوں جن کے خریدار میری تقریر کی وجہ سے ایک ایک کر کے سب باہر چلے گئے ہیں۔ان اہل زبان حضرات سے معافی مانگتا ہوں جن کو میرا لہجہ ناگوار معلوم ہو رہا ہے اور جو میری زبان کی غلطیوں پر پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ان زبان داں حضرت سے معافی مانگتا ہوں جو ہندوستانی نہیں سمجھتے ان میاں بیوی سے معافی مانگتا ہوں جن کے باہمی اخلاص کی گفتگو میں مخل ہو رہا ہوں' اس اخبار نویس دوست سے بھی معافی مانگتا ہوں جس کے فرض کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اخبار میں میری تقریر کی دھجیاں اڑا دے۔لیکن جس کی طبعی شرافت کا یہ تقاضا ہے کہ میری کوتاہیوں کو نظر انداز کر دے۔اس دل جلے سے معافی مانگتا ہوں جس کی تقریر مجھ سے بہت بہتر تھی لیکن اسٹیشن ڈائریکٹر صاحب نے اسے پچھلے ہفتے رد کر دیا۔ان اصحاب سے بھی معافی مانگتا ہوں جنہوں نے ریڈیو کا لائسنس تک نہیں لیا اور جن کا گناہ میری تقریر کی وجہ سے گناہ بے لذت ہو رہا ہے اور آخر میں ان غائب حضرات سے معافی مانگتا ہوں جنہوں نے ریڈیو بند کر رکھا ہے اور گھڑی پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں کہ کب میری تقریر کا وقت ختم ہو اور وہ ریڈیو کھولیں۔

تو اب میں کیا کہوں کہ ریڈیو والوں پر کیا گزرتی ہے یا بقول اسٹیشن ڈائریکٹر صاحب کے براڈ کاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔اگر آپ ان لوگوں میں سے ہوں جن کو اشارہ کافی ہوتا ہے تو جو کچھ میں اب تک عرض کر چکا' اس سے آپ اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ خدا کے ان حقیر بندوں کو جو آپ کے کانوں کی ضیافت کا سامان مہیا کرنے پر مقرر ہیں کس رکھ رکھاؤ کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔اس لیے دو ایک باتیں جو مجھے اور کہنی ہیں سوچتا ہوں کیونکہ کہوں اور کس زبان سے کہوں کہ آپ کی سماعت پر گراں نہ گزریں۔ریڈیو والوں کو تو آپ نے حکم دے رکھا ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھو چنانچہ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ نہ ہو کہ یہ عمر عزیز پھونکیں مارنے ہی میں ختم ہو جائے اور قدم اٹھانے کی نوبت بھی نہ آئے۔مثال کے طور پر یہی دیکھ لیجئے کہ میں براڈ کاسٹر کا حال بیان کر رہا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ آپ کو براڈ کاسٹر کا لفظ ہی بیہودہ اور ثقیل معلوم ہوگا۔لیکن اس میں ہمارا کیا قصور میں اس سے بہتر لفظ کہاں سے لاؤں ریڈیو کے قدر دانوں نے یوں تو ریڈیو والوں کے لیے وقتاً فوقتاً بڑے بڑے جذباتی نام تجویز کیے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر ایسے ہیں کہ آپ کے سامنے دہراؤں تو

آپ ہی کہیں گے وہ دیکھو ریڈیو لوگوں کے اخلاق کو بگاڑ رہا ہے لہٰذا مجبور ہوں کہ یہی بیہودہ اور ثقیل لفظ استعمال کروں۔ اگر براڈ کاسٹر کی بجائے اپنے آپ کو ریڈیو والے کہیں تو لوگ فوراً پوچھنے لگتے ہیں کہ آپ کی دکان کہاں ہے؟ ایک دوست سے میں نے یہ تکلیف بیان کی تو کہنے لگے۔ "تو کیوں نہیں سوچ سوچ کر کوئی اچھا سا نام اپنے لیے تجویز کر لیتے۔" میں نے کہا "آپ ہی فرمائیے۔" بولے "یہ ریڈیو کا دھندا تو ہوا کا کھیل ہے۔ تم چوکیدار نمبردار کے وزن پر اپنا نام ہوادار کیوں نہیں رکھ لیتے۔" میں نے کہا یہ لفظ تو مجھے کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ بولے ذرا غور کرو تو ہر نیا لفظ تو ہمیشہ غیر مانوس معلوم ہوتا ہے اگر ہوا کی مناسبت سے تم ہوادار کا لفظ اختیار کر لو تو زبان کی کئی اور دقتیں رفع ہو جائیں گی اور جو لوگ تم لوگوں سے ہمیشہ اپنی تقریریں کروانا چاہتے ہیں وہ ہوا خواہ کہلائیں گے اور جو لوگ ریڈیو کی خواہ مخواہ مخالفت کرتے ہیں وہ گویا ہوا سے لڑتے ہیں اور چاہو تو ان کی باتوں کو بادِ مخالف کہہ لو۔ جو ہدیہ یا نذرانہ تم اہل فن کی خدمت میں پیش کرتے ہو وہ ہوائی رزق کہلائے گا اور جو شخص گھر میں ریڈیو تو لگاتا ہے لیکن لائسنس کی فیس ادا نہیں کرتا وہ خوتی چور کے وزن پر ہوا چور کہلائے گا یا آدم خور کے وزن پر ہوا خور اور اس کا یہ جرم عدالتوں میں ہوا خوری کے نام سے مشہور ہو گا۔ میں نے کہا "حضرت ہم نئے الفاظ وضع کرنے سے باز آئے۔ براڈ کاسٹر ثقیل اور بیہودہ سہی لیکن اس پر سر پھٹول تو نہ ہو گی۔ پہلے ٹرانسمیشن کا لفظ بھی اسی طرح بیہودہ اور ثقیل معلوم ہوتا تھا جب اس کی بجائے محفل یا مجلس کا لفظ استعمال کرنے لگے تو کسی نے تمغہ تو نہ بھیجا۔ البتہ ایک دیندار بزرگ پیچھے پڑ گئے۔ "کیوں صاحب کہاں محفل میلاد اور مجلس عزا اور کہاں ریڈیو والوں کی دھما کہ چوکڑی؟ آپ کو محفل یا مجلس کا لفظ استعمال کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔" اور بعض حضرات نے کہا کہ کیوں صاحب مجلس کسے کہتے ہیں؟ یہ لفظ تو آج تک ہم نے کبھی نہیں سنا اور نہ ہم جانتے ہیں کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ کوئی آسان سا لفظ استعمال کیجیے اس پر مجلس کی جگہ سبھا کا لفظ استعمال ہونے لگا اس پر بھی کسی نے تمغہ نہ بھیجا۔ البتہ چند مہربانوں نے نہایت ملامت سے یہ ضرور سمجھایا کہ اگر یہ لفظ بدلا نہ گیا تو ہم ریڈیو اسٹیشن کو آگ لگا دیں گے اور کم از کم ایک اسٹیشن ڈائریکٹر یا اس کے بدلے میں دو پروگرام اسسٹنٹوں کو قتل کر ڈالیں گے۔ بات بات پر یاں زبان کٹتی ہے۔ ساٹھ ہزار سننے والے ہیں اور یوں سمجھیے کہ

ہر سننے والے نے ریڈیو والوں کے پاؤں میں ایک زنجیر ڈال رکھی ہے جس کو وہ خدا جانے کیا خدشہ محسوس کر کے وقتاً فوقتاً کھینچتا رہتا ہے۔ گویا ریل والوں کی اس نصیحت پر عمل کرتا ہے کہ اگر اپنی حفاظت چاہتے ہو تو کھینچو زنجیر کو چنانچہ اب خیال آتا ہے کہ ٹرانسمیشن کا لفظ ہی رہنے دیتے تو بہتر ہوتا۔

میرے دوست یہ سن کر خاموش ہو گئے میں بھی چپ ہو رہا لیکن میری زبان خاموش تھی۔ دل خاموش نہ تھا دل کہہ رہا تھا کہ کیا سچ مچ ٹرانسمیشن کا لفظ ہی رہنے دیتے تو بہتر ہوتا۔ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں براڈ کاسٹر کی سب سے بڑی آرزو یہ ہونی چاہیے کہ یہاں کے ریڈیو کو خدا ہندوستان ہی کا رنگ و روغن نصیب کرے۔ کیا یہ محض لاف زنی تھی یا کیا اس آرزو میں اتنی قوت نہیں کہ مشکلات کا مقابلہ کر سکے۔ دل کے اس سوال نے مجھے لاجواب کر دیا اور اب جبکہ صرف دو تین منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ سے مشورہ کر لوں کہ اس آرزو کے پورا کرنے کی کیا ترکیب ہے۔ وہ کیا ترکیب ہے جس سے اس مشین میں جو سمندر پار سے یہاں آئی ہے اور جو ریڈیو کہلاتی ہے ہندوستانی دل کی سی دھڑکن پیدا ہو جائے؟ وہ کیا ترکیب ہے جس سے یہ بات پیدا ہو جائے کہ جب ساٹھ ہزار یا لاکھ یا دس لاکھ یا دس کروڑ گھروں کے اندر ریڈیو سپیکر یک آواز ہو کر بولیں تو آپ کا کان پہچانے اور دل گواہی دے کہ یہ ہندوستان کی آواز ہے۔ جو تہذیب اور فن اس مشین کے ذریعہ سے کانوں کے رستے دلوں میں سرایت کرے وہ ہندوستان کی بہترین تہذیب اور ہندوستان کا بہترین فن ہو۔ جس سے دلوں میں اُمنگیں پیدا ہوں اور دماغوں میں اُجالا ہو جائے۔ یہ بات ہو تو براڈ کاسٹر صحیح معنوں میں آپ کا ہوادار کہلانے کا مستحق ہو گا۔ ورنہ یہ سب ہوائی باتیں ہیں لیکن اگر ہم اپنے ہاتھوں سے ایک دوسرے کا گلا گھونٹتے رہے تو ریڈیو پر صرف زخمی تہذیب اور سسکتے ہوئے فن کی چیخیں سنائی دیا کریں گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم سننے والے اور بولنے والے دونوں ایک دوسرے کے گلے سے اپنا اپنا ہاتھ ہٹا لیں۔ اپنی کہیں اور دوسرے کی سنیں۔ کچھ عرصہ کا ذکر ہے دلی میں ایک جوشیلا اخبار نکلا کرتا تھا جس کا نام تھا "سنادی"

اس سے آپ کو بھی انکار نہ ہو گا کہ اس نام میں ایک خوشدلی اور خوش طبعی ضرور پائی جاتی ہے لیکن اگر ہر شخص کا اصول یہی ہو کہ "سنادی" تو تہذیب کو بچانے کے لیے چند ایسے

لوگوں کو تلاش کرنا پڑے گا جن کا اصول یہ ہوگا کہ ''کبھی کبھی سن بھی لی'' اگر یہ نہ ہو تو حق راستی اور خوش ذاتی اور تہذیب یہ سب خوبیاں گونگی ہو کر رہ جائیں گی اور ریڈیو کی حالت اس بزدل خوشامدی کی سی ہو جائے گی جس کا جھوٹ بھی جھوٹ ہوتا ہے اور سچ بھی جھوٹ ہوتا ہے۔ دنیا میں باتیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک تو خدا لگتی اور دوسری وہ بات جو زمانہ سازی کی غرض سے زمانے کی ہوا کو دیکھ کر کی جائے' گویا ہوا لگتی بات میں سمجھتا ہوں وہ دن ریڈیو کے لیے موت کا دن ہوگا جب اس پر ہمارے ہزارہا سننے والے جن کی خوشنودی پر ہمارے محکمے کی بہبود کا انحصار ہے' ہوا لگتی بات سننا چاہیں گے اور خدا لگتی بات سننا گوارا نہ کریں گے۔ میں نے آج آپ سے خدا لگتی اور ہوا لگتی دونوں قسم کی باتیں کی ہیں نا معلوم آپ کو کون سی باتیں پسند آئیں شاید دونوں بری معلوم ہوئیں۔ بہر حال بیہودہ سے بیہودہ کلام بھی آخر ختم ہو جاتا ہے اور اب میں بھی اس کلام کو ختم کرتا ہوں۔ مقطع افسوس ہے کہ میں نے نہیں لکھا۔

☆☆☆

فرہنگ

موضع: گاؤں، جگہ، مکانی، ٹھکانہ۔ طائفے: طائف کی جمع، طواف کرنے والا، چکر کاٹنے والا، اردگرد پھرنے والے۔ باحمیت: غیرت مند، عزت والا۔ سوہان: ریتی، لوہا یا لکڑی صاف کرنے کا خاردار اوزار۔ مخل: خلل ڈالنے والا، رخنہ انداز، مفسد، فتنہ پرداز۔ لاف زنی: شیخی، خودستائی، تعلّی۔

دوست کے نام

از لاہور

اے میرے کراچی کے دوست!

چند دن ہوئے میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں فنون لطیفہ کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جو وقتاً فوقتاً تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کیا کرے گی۔ واضح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے کرتا دھرتا کون اہل جنون ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا بے انتہا شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آرٹ کا ذوق صحیح رکھتے ہیں اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں گے بلکہ عجب نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو اور آپ ہی نے اپنی جاذبیت سے ایسے خوش مذاق لوگوں کو ایک نقطے پر جمع کر لیا ہو جنہیں شوق تو ہے لیکن آپ کا سا شغف نہیں۔ یہ سوچ کر بہت اطمینان ہوا کیونکہ اپنے خیالوں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو ضرور ایک گونہ تقویت قلب نصیب ہوگی۔ ورنہ تن تنہا کتابوں اور تصویروں سے راز و نیاز کی باتیں کرتے کرتے انسان تھک جاتا ہے۔ ذوق سلم کی تازگی پر تنہائی کی وحشت اور تلخی غالب آنے لگتی ہے انسان دیوانہ نہیں تو علیل الدماغ ضرور ہو جاتا ہے اور غالب کا ایک مصرعہ قافیہ بدل کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ:

"مقدور ہو تو ساتھ رکھوں راز داں کو میں"

لیکن اے دوست! کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی اخبار نے جل کر یہ نہیں لکھا کہ پاکستان پر ابتلاء کا زمانہ آیا ہے اور آپ جیسے خوش فکروں کو مصوری اور نقاشی کا شوق چرایا ہے؟ کسی نے جلتے ہوئے شہر روما اور نیرو کی سارنگی کا فقرہ

نہیں کسا؟ کسی ''دستوں چشم بددور ہیں آپ دیا کے'' نے مسجد میں وعظ کرتے ہوئے آپ کے لہو ولعب اور تفریح کوشی پر نفرین نہیں کہی؟ اور آپ پر کفر اور شرک اور الحاد کا فتویٰ لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی گھاگس مصلحت بین افسر نے ہمدردی اور تہذیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ برخوردار:

بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است؟

اور بالفرض ان باتوں سے بچ نکلے تو کیا ضمانت کے موقعے پر کسی نیم تعلیم یافتہ ہم عصر نے جو تنخواہ میں آپ سے برتری کا دعویٰ دار ہے آپ کی آزاد مشی کا مضحکہ نہیں اڑایا؟ اور جب آپ پٹے ہوئے نظر آئے تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوئے؟

اگر آپ کو ایسی منزلیں پیش نہیں آئیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہو گی یا پھر بیزاری اور بددلی پک رہی ہوگی اور آپ کو ابھی دکھائی یا سنائی نہ دی ہوگی۔ ورنہ جس حسن مذاق پر آپ کو غرہ ہے وہ تو آج کل ایک مہاجر یتیم کی طرف بھوکا اور ننگا کسی کھنڈر کے کونے میں سر بہ زانو دبکا بیٹھا ہے اور باہر پڑا پڑ مینہ برس رہا ہے اور آندھیاں چل رہی ہیں۔

پچھلے سال قائداعظم یہاں تشریف لائے۔۔۔۔ اور وہ باغ جس کو لارنس گارڈن کہا کرتے تھے اس میں جو قطعہ ''روز گارڈن'' کہلاتا تھا وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن جو پاکستانی لاہور کا پہلا جشن کا دن تھا۔ روز گارڈن کا نام ''گلستان فاطمہ'' رکھا گیا اور یہ نام ایک بورڈ پر لکھ کر باغ میں جو چھوٹی سرخ اینٹوں کی خوب صورت محراب ایستادہ ہے اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا لیکن اس کی کتابت ایسی کریہہ اور طفلانہ تھی کہ مدرسہ کے لڑکوں کو بھی کسی انسپکٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ لگاتے ہوئے شرم آتی۔ ''گلستان فاطمہ'' کی بے ذوق ترکیب سے قطع نظر کیجئے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجئے جس کی بدولت نہ وہ غریب ہی اس نام سے مانوس ہوں گے جو دوپہر کے وقت درختوں کے سائے میں اپنا گرد آلود جوتا سر کے نیچے رکھ کر اس باغ میں سو جاتے ہیں اور نہ وہ پتلون پوش ہی اس میں کوئی کشش پائیں گے جو شام کے وقت موٹروں میں سوار ہو کر یہاں ٹینس کھیلنے آتے ہیں لیکن جب ان جلوے کی پیاسی گنہگار آنکھوں نے اسے یوں ایک نمایاں جگہ پر منقوش دیکھا تو نظر اور دل دونوں مجروح ہوئے کیونکہ ایسے شان دار موقع کے لیے اس سے بدصورت کتابت کی

نمائش ذہن میں نہ آ سکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم' وہ قوم جو کئی پشتوں سے فن خوشنویسی کی علمبردار ہے جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس صناعی اور ہنرمندی سے لکھے کہ کاتب قدرت نے بھی ان کو آفرین کہا ہوگا۔ پنجاب کا خطہ وہ خطہ جسے نستعلیق کی ایک جدید اور جمیل طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے لاہور کا شہر' وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوشنویس رہتا ہے اور جہاں عظیم فقیر محمد مرحوم جیسے استاد فن پیدا ہوئے جن کے سامنے ہندوستان بھر کے جادو رقم زانوئے قلم تہ کرتے تھے اور اس پر یہ حال کہ اس تقریب سعید پر اس شہر میں' مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ لکھنے پڑیں اور ان کے بھی دائرے غلط ہوں اور نشست بے ڈھنگی ہو۔ آپ دیکھتے تو یقیناً آپ کو اس کی تہ میں بدمذاقی کا عروج نظر آتا اور آپ پر پژمردہ ہو جاتے اور ڈھونڈتے پھرتے کہ کس کے پاس جا کر شکایت کروں اور لوگ آپ کو دیوانہ سمجھتے اور بعض ایسے بھی ہوتے کہ ایسی خردہ گیری پر آپ کو بدتمیز کہتے یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن سمجھیں یا حسن کہیں۔ ورنہ آپ پر پاکستان میں کیڑے ڈالنے کا الزام لگتا اور آپ کی وفاشعاری پر حرف آتا۔

اب آپ اس انجمن کے چکر میں اپنے آپ کو کسی منبر پر پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم جمع ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں تو آپ جو سینے میں دردمند دل رکھتے ہیں یہ کہنے سے کیوں کر باز آئیں گے کہ اے مسلمانو! تمہارے آباؤ اجداد خط اور دائرے اور خم اور زاویے کا وہ ذوق رکھتے تھے کہ دنیا میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ کوفی اور طغریٰ نستعلیق اور نسخ' کس کس نہج سے انہوں نے ابجد سے عشق کیا ہے۔ ان کے ایوانوں میں آویزاں وصلیوں کو دیکھو' ان کے مطلا اور مذہب نسخوں کو دیکھو' ان کے روضوں اور محلوں' ان کی مسجدوں اور خانقاہوں ان کے فرامین اور سکوں اور مہروں' ان کی قبروں اور ان کے کتبوں کو دیکھو۔ مرگ یا زیست کا کوئی مقام۔ سطوت یا افلاس۔ مسرت یا ماتم۔ جشن یا یکسوئی۔ خلوت یا جلوت کا کوئی مقام آیا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف کے لافانی نقوش چوب و قرطاس و سنگ پر ثبت نہ کر دیئے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمہیں اپنے کلچر کے احیاء اور تحفظ کے لیے سب قوتیں تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں قسمیں کھالو کہ اس ورثہ کو ہاتھ سے جانے نہ دو گے اور عہد کر لو کہ آج

سے تمہاری دکانوں تمہارے مکانوں' تمہارے دفتروں' تمہاری کتابوں اور اخباروں اور رسالوں' تمہاری مسجدوں اور تمہارے مزاروں' تمہارے سرناموں اور تمہارے نوٹس بورڈوں پر جہاں جہاں تمہارے ہاتھ ابجد کے خط کھینچیں گے اسلاف کا نام روشن کریں گے اور جو نزاکتیں اور لطافتیں اور رعنائیاں انہوں نے صدیوں میں پیدا کی ہیں انہیں مسخ نہ ہونے دیں گے تاکہ جہاں کسی کو تمہاری تحریر نظر آئے وہ جان لے کہ یہ مسلمان کا لکھا ہوا ہے۔اس قوم کا لکھا ہوا ہے جس نے دنیا میں خوش خطی کا مرتبہ بلند کیا اور جواب بھی اپنی حسن آفرینی پر ناز کرتی ہے۔

یہ کہنے سے آپ کیونکر باز آئیں گے؟ لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں ہیں ایسے لوگ؟ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنا لی ہے۔اور پھر خوش نویسی تک تو عافیت رہے گی لیکن کیا آگے بھی بڑھیے گا؟ تصویروں کا ذکر بھی کیجئے گا؟ اخبار میں لکھا تھا کہ آپ تصویروں کی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں۔یہ سچ ہے تو اے دوست! وقتاً فوقتاً مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیے گا کیونکہ اگر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بے انتہا جسارت سے کام لینا پڑے گا اور عجب نہیں کہ لوگ آپ کا حال دیکھ کر عبرت پکڑا کریں۔

ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جسے آپ صحیح معنوں میں آرٹ سکول کہہ سکیں۔لاہور یونیورسٹی کے نصاب میں آرٹ بہ حیثیت ایک مضمون کے شامل تھا لیکن یہ ایک مخلوط سا شغل تھا جس میں تھوڑی سی موسیقی' تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دستکاری سب چٹکی چٹکی بھر پھینک دی گئی تھیں اور اس معجون کو ایک زنانہ مشغلہ سمجھ کر صرف لڑکیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔یہ مضمون اب بھی نصاب میں موجود ہے لیکن کب تک؟ فی الحال تو ایک یورپین خاتون میسر ہیں جو یہ مضمون پڑھاتی ہیں وہ کہیں ادھر ادھر ہو گئیں اور کوئی عورت ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئی تو یہ قصہ بھی پاک ہو جائے گا۔کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام خدانخواستہ کسی مرد کے سپرد ہوا تو زلزلے نہ آ جائیں گے؟ اور پھر اس مضمون کا حلیہ بھی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔موسیقی تو تہہ کر کے رکھ دی گئی ہے کیونکہ ہو تو بھلا کسی کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے دستخط سے یہ لکھوا بھیجے کہ ہمیں گانے کا شوق ہے؟ باقی رہی

تصویر کشی تو ایک ملنے والے اگلے دن سنا گئے کہ ایک کالج نے کہلوا بھیجا ہے کہ ہماری لڑکیاں جان داروں کی شکلیں نہ بنائیں گی۔ چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف سیب' ناشپاتی' مرتبان' یا پہاڑ دریا' جنگل پر کی جائے۔ اس پر ایک آدھ جگہ بحث ہوئی۔ شریعت کا قدم درمیان میں آیا۔ ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ڈھیل دی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں تو ہرگز جائز نہیں فوٹو البتہ جائز ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہ ہو بہو ایسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جائے تو اس میں جھوٹ ضرور سرایت کر جاتا ہے۔ کسی نے کہا فوٹو بھی تو کئی حرفتوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹوگرافر بھی تو بڑے فنکار ہوتے ہیں۔ جواب ملا کہ چابکدستی اور تکلف سے کام لیا جائے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ غرض کہ ان کے نزدیک اسی ایک فوٹوگرافر کا کام حق و راستی کا آئینہ دار ہے جو لاہور کے چڑیا گھر کے باہر چار آنے میں تصویر کھینچتا ہے۔ یہ حال تو جان دار اشیاء کا ہے۔ باقی رہے جنگل' پہاڑ' دریا تو وہاں بھی ایک نہ ایک دن کوئی کوتوال حق بین مصوروں کے ''جھوٹ'' کو گردن سے جا دبوچے گا اور آپ چیختے اور سسکتے رہ جائیں گے کہ یہ تو وین گوگ ہے! یہ بہت بڑا آرٹسٹ ہے اور آپ کے ہاتھوں سے تصویر نوچ کر پھاڑ دی جائے گی۔

ان حالات میں چغتائی کے جینے کا امکان بہت کم ہے کوئی بات ''سچ'' بھی ہوتی ہے۔ اس کی تصویروں میں؟ درخت تک تو مجنوں کی انگلیاں معلوم ہوتے ہیں اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تو وہ نہیں چوکتا اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی۔ غزالی چشم' سینہ چاک اور بعض اوقات محرم کے بند تک دکھائی دے جاتے ہیں۔ گو یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ چغتائی کی تصویروں میں تسمے' ڈوریاں' پھندنے بہت ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ تکمہ یا ڈوری لیلیٰ کے لباس کا حصہ ہے یا ناقہ کے ساز و سامان کا۔ لیکن چغتائی کی وجہ سے ایک سہولت ضرور نظر آتی ہے وہ یہ کہ لے دے کے یہی ایک ہمارا مصور ہے اسے دفن کر دیا تو یہ وبا فوراً تھم جائے گی اور ہماری مصوری ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائیگی۔ باقی رہی مغلوں کی قدیم تصویریں یا ایرانی مصوروں کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس لبطور تبرک محفوظ ہیں یا جن کی انڈیا آفس کے عجائب خانے کی تقسیم کے بعد پاکستان کو مل جانے کی امید ہے تو ان کو کسی اور ملک کے ہاتھ بیچ کر دام وصول کیے جا سکتے ہیں۔ کیا

کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں؟ اگر نہیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی۔

لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ کراچی کون سا ایسا جزیرہ ہے اور کون سے گم شدہ براعظم میں واقع ہے کہ اردگرد کے سمندر کی کوئی لہر وہاں تک نہ پہنچ سکے گی؟ آپ کو تعمیر اور تخلیق کی سوجھ رہی ہے لیکن یہاں تو تخریب کا دور دورہ ہے۔ ہاتھوں سے لٹھ چھین کر اس کی جگہ قلم اور موقلم آپ کیونکر رکھ دیں گے؟ آپ کوئی سا ہیجان پیدا کیجئے آپ کے دیکھتے دیکھتے وہ تخریب کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ لوگ جس چیز کا نعرہ لگا کر اٹھتے ہیں سب سے پہلے اسی چیز کا خون کر لیتے ہیں۔ آپ کہیے کہ رمضان کا احترام واجب ہے تو لوگ ٹولیاں بنا بنا کر بازاروں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کس کا منہ کالا کریں۔ آپ اسلام کی دعوت دیجئے تو تلاشی شروع ہو جاتی ہے کہ کس کے درے لگائیں۔ کسے سنگسار کریں؟ آپ حیا کی تلقین کیجئے تو لوگ سر بازار عورتوں کے منہ پر تھوکنے لگتے ہیں اور بچیوں پر اپنا بہیمانہ زور آزماتے ہیں۔

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟

ایسے غیظ و غضب کی فضا میں بھی آج تک کہیں آرٹ پنپا ہے؟ آرٹ کے لیے تو ضبط اور نسق اور استحکام اور اخلاق اور فراغ لازم ہیں یا پھر کوئی ولولہ کوئی امنگ کوئی عشق جو دلوں کے دروازے کھول دے اور ان میں سے شعر و سخن' نغمہ و رنگ کے طوفان اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں۔ کیا کبھی آرٹ ایسے میں بھی پنپتا ہے؟ کہ ہر بڑے کو دولت اور اقتدار کی ہوس نے اندھا اور بہرہ کر رکھا ہو اور ہر چھوٹا اپنی بے بضاعتی کا بدلہ ہر ہمسائے اور راہگیر سے لینے پر تلا ہوا ہو' نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر قیمت کی پوری چیز نصیب ہو اور لوگ فاقے کے ڈر سے نجات پا کر قناعت کی گود میں ذرا آنکھ جھپک لیں نہ کوئی اخلاقی نظام ایسا ہو کہ لوگوں کو اس دنیا یا اس دنیا میں کہیں بھی جزا و سزا کی امید یا خوف ہو۔ نہ مسرت کا کوئی ایسا جھونکا آئے کہ درختوں کی ٹہنیاں مست ہو کر جھومیں اور پتوں کی سرسراہٹ سے آپ ہی آپ نغمے پیدا ہوں۔ نہ عافیت کا کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں آپ کا فنکار معتکف ہو کر بیٹھ جائے اور آپ کے لیے تصویریں بناتا رہے' نہ آس پاس کوئی ایسی نرالی ہستی ہو' جہاں شاعر غریب شہر بن کر گھومتا پھرے اور لوگ اسے دیوانہ اجنبی سمجھ کر اسے بک لینے دیں۔ فنون

لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنالی ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو کہ چند تصویروں کو مخرب اخلاق اور عُریاں کہہ کر جلا دیا جائے چند مصوروں پر اوباشی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے یا پھران پر ایسے لوگ مسلط کر دیئے جائیں جوان کے ہنر کو کھردری سے کھردری کسوٹیوں پر پرکھیں اوران پر واضح کر دیں کہ جس برتری کا انہیں دعوے تھا اس کا دوراب گزر گیا۔

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو عشرت نہیں سمجھتے' اسے محض امارت کا دل بہلاوا نہیں سمجھتے آپ ایسے نہیں کہ آپ کو جاندار ہی کی تصویر پر اصرار ہو یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو۔حسن کو اختیار ہے جہاں چاہے رہے جو شکل چاہے اختیار کرے صرف یہ ہے کہ زندہ رہے اور امیر غریب' چھوٹے بڑے' ادنیٰ واعلیٰ سب پر اپنی بخششیں فرمائے۔ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت وحرفت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔آپ تو اس عہد زریں کو واپس لانا چاہتے ہوں گے تاکہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں' کسان کے تہمد میں' سیلانی کے ہاتھ کی چھڑی میں' پنساری کے مٹی کے گھڑوں میں غرض زندگی کے ہر گوشے میں نور پاش ہو لیکن جو ننھی ننھی شمعیں یہاں وہاں ٹمٹما رہی ہیں انہیں ہی بجھا دیا گیا تو لاکھوں انسانوں کی زندگیاں جو ابھی تک تاریک پڑی ہیں وہ کیسے جگمگائیں گی؟ کیا کراچی میں جو آپ کے ہم جلیس ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ آرٹ کی ایک مسکراہٹ کے لیے انہیں اس بیگانہ تبسم ماحول میں کئی صحرا چھاننے پڑیں گے۔

فرحتے نیست کہ در پہلوئے آں صد غم نیست
روز مولود جہاں کم زشب ماتم نیست

اگر یہ محض میرا وہم ہے تو اے دوست! پھر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہو گی تو پھر اے دوست! ہم سب کو وہاں بلا لیجئے یا کراچی کو اتنا وسیع کیجئے کہ ہم سب اس میں سما جائیں۔

کراچی میں آپ نے بہت کچھ رسوخ پیدا کرلیا ہوگا۔آپ کے اخلاص اور اصابت

رائے کے سب لوگ قائل ہوں گے۔ بڑے بڑے افسروں سے آپ کی ملاقات ہو گی۔
بڑے بڑے ارباب حل وعقد کا قرب نصیب ہوگا۔ ان سے کہیے کہ:

منزل راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے؟

☆☆☆

فرہنگ

مساعی: مسعمات کی جمع، کوششیں۔ گونہ: اسلوب، وضع، کسی قدر۔ ابتلاء: آزمائش، امتحان، جانچ، مصیبت، بلد۔ دستوں: دست کی جمع، ہاتھ، پنجہ، قدرت، طاقت، غلبہ، فتح۔ نفرین: علامت، پھٹکار، لعنت۔ الحاد: سیدھے راستے سے کترا جانا، دین حق سے پھر جانا، ملحد ہو جانا۔ گھاگس: گھاگھس، ایک قسم کا دوغلا مرغا۔ چنگ: ستار کی قسم کا ایک باجا، کوئی چیز جو ٹیڑھی اور جھکی ہوئی ہو۔ غرہ: گھمنڈ، غرور، ناغہ، تعطیل۔ ایستادہ: کھڑا۔ کریہہ: مکروہ، قابل نفرت، بدشکل۔ نستعلیق: فارسی یا اُردو کا ایک رسم الخط جو صاف اور سیدھا ہوتا ہے۔ نہج: روشن اور کشادہ راستہ، طور، طریقہ، ڈھنگ، قاعدہ۔ ابجد: حروف تہجی، کسی علم یا فن کی مبادیات ابتدائی باتیں۔ لٹھ: لاٹھی، ڈنڈا۔ موقلم: مصوروں کا باریک برش، بالوں کا قلم۔ اصابت: رسائی، پہنچ، ٹھیک بات کہنا، صحیح نتیجے پر پہنچنا۔

کوائف کواڈرینگل

اگر مجھے کواڈرینگل سے الفت ہے تو اس میں رقابت کو کوئی دخل نہیں، نئے بورڈنگ ہاؤس کی دلفریبیاں لیسے بھر کو باصرہ افروز سہی حسد انگیز نہیں ہوسکتیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عدالت ضلع کے پڑوسی اپنے نئے نویلے حسن کے گھمنڈ میں آکر کواڈرینگل کے ذکر خیر میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے اور بات بات پر جھٹ غسل خانوں کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں۔ لیکن کواڈرینگل کی متانت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس چنچل پن کا اظہار اس کی طرف سے بھی کیا جائے۔ سنا گیا ہے کہ جب اس ایوان عالیشان کا کوئی مکین تجلہ آراء وہاں کی ایوان عالیشان سے تنگ آکر نقل مکانی کا ارادہ کر لیتا ہے اور مہاجر فی سبیل اللہ بن کر اس شان کے ساتھ نکلتا ہے کہ جلو میں ایک بھنگی حضرت کا رنگین اور منقوش ٹرنک اٹھائے ہوتا ہے۔ (جو معلوم ہوتا ہے کہ والدین نے انٹرنس پاس کرنے کے صلے میں مرحمت فرمایا تھا) میمنہ پر کچن کا ایک ''کانگ پا'' بچگانہ سائز کا نوکر بسترے کو سرآنکھوں پر رکھے، میسرہ پر کچن مذکور کا معتمد ترین ملازم گھی کا ڈبہ اٹھائے۔ جس میں ملر کا کوچک ترین تالا (کمسنی ہے تو نرالی ہے ادا بھی ان کی) کنڈے کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتا آتا ہے۔ خود ایک ہاتھ میں ہاکی سٹک سے کنکروں پتھروں پر دل کی بھڑاس اس نکالتے ہوئے جب یہ روح فرسا جلوس نئے ہوسٹل سے نکلتا ہے تو سنا گیا ہے کہ ہر شخص اپنی استطاعت سے الاپنا شروع کر دیتا ہے کہ ''ارے مورے سیاں! سوتن گھر نہ جا'' لیکن کواڈرینگل نے کبھی ایسے خانہ بدوشوں سے یہ نہیں کہا کہ ''وہیں جاؤ شیام جہاں رین رہے'' کواڈرینگل جانتا ہے کہ اگرچہ ہمارے ہاں غسل خانوں کے نلکوں کی بوندا باندی اکثر اوقات محض بپتسمے کی اغراض کے لیے کافی ہوسکتی ہے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ ہر

ایک بھلے آدمی کی غلاظت اس درجہ تک پہنچی ہو کہ اسے چوبیس گھنٹے آب رواں کی ضرورت ہو۔ ہر وہ شخص جو فطرتاً نذکی اور طبعاً مطہر ہے۔ دجلہ اور فرات اور نیئے ہوسٹل سے بے نیاز ہے۔

کواڈرینگل کے وسعت و شوکت کا لطف کچھ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جن کی زندگی سادہ اور جن کے خیالات ارفع ہیں۔ علے الصباح ''ارلی برڈز'' کا صور پھونکا جاتا ہے۔ ایک محشر خفتہ کروٹ لیتا ہے اور چند لمحوں کے بعد بیدار روحیں اپنے اپنے کیش و دین کے مطابق اپنے نامہائے اعمال' گڈویاں اور لوٹے اٹھائے غسل خانوں کا رخ کرتی ہیں۔ ٹونٹی کی غایت درجہ کی فیاضی اور کشائش کے بعد ایک آنسوؤں کا تار اپنی ہلکی ہلکی موسیقی کے ساتھ لوٹے میں پڑنا شروع ہوتا ہے۔ جس دوران میں صاحب استقساء کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنی نیند کی کمی جھپکی دو جھپکی سے پورا کر لے۔ ہمارے ایک مہمان جو ہمارے پاس کچھ دیر کے لیے مقیم تھے اور جنہیں اپنی قمیض پر سے شوربے کا ایک داغ دھونے کے لیے ہمارے غسل خانے تک جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اب تک اس بات کے معترف ہیں کہ کسی دارالعلوم میں خشک دواتوں میں بوندیں ٹپکانے کا اس سے بہتر انتظام نہیں دیکھا گیا تو صاحب اس صدف آسائی کے بعد چند اور منازل ناگفتنی طے کر کے اس عمل ''کم خرچ بالانشین'' کی باری آتی ہے۔ جسے نہانا کہتے ہیں جس کی تفصیل مجملاً یوں ہے کہ کپڑے اتار کر نل کے نیچے بیٹھ گئے اور خدا کے حضور میں دعا مانگنی شروع کر دی کہ اللہ میاں! پانی بھیج' تقاطر رحمت شروع ہوا تو جلدی جلدی پتسمہ لیا۔ ''خارج از دھوتی'' جسم کا مسح کیا۔ دامن کو کچھ تر کر لیا بس اتنا کہ ''نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔'' اور پھر اس غسل تبرک کے بعد ''یا مظہر العجائب' نلکا حاضر مگر پانی غائب'' خدا کا شکر کیا کہ بندہ بشر ہی تو ہے کہیں صابن کا استعمال ہو جاتا۔ خداوند تعالیٰ کو یہ تکبر ناپسند ہوتا اور اسی طرح پانی بند ہو جاتا کہ وہی اپنا سا صابن آلود منہ اٹھائے کمرے میں آ کر حجامت کرنے لگ جاتے اور دن بھر لوگ ہماری آنکھوں کے سرخ ڈوروں پر نظر کیا کرتے۔ خیر کپڑے پہنے اور بھیروں گاتے ہوئے دھوتی کو اس شکل میں اٹھائے کہ ابھی نچوڑے کے پیچ در پیچ صعوبات کا اثر اس سے ذرا بھی زائل نہ ہوا ہو۔ (گویا ابھی بھیگی بلی تھی) بالوں کو جھاڑتے ہوئے ضبط لرزہ اور سعی خوش خرمی کے بین بین انداز سے کمرے کی طرف گامزن ہوئے۔ کمرے میں پہنچ

کرتہ کی ہوئی پتلون کو تکیے کے نیچے سے نکال کر پہنا۔کالر دریوزہ کی دریوزگی اندر کی طرف الٹا کر زیب گلو کر لیا۔ٹوپی کی آشفتگی و وارفتگی کو (جس کی وجہ عام طور پر گتے کا اندر ہی اندر سے دل بیٹھ جانا ہوتی ہے) منت خوشامد سے تھپکا چمکار کر سر پر رکھا۔درویش صفت باش وکلاہ تتری دار۔ڈائننگ روم میں آئے۔دال کھائی اور باہر نکل کر دھوپ میں ٹہلنا شروع کر دیا اس وقت کواڈرینگل کی وسعت کا فائدہ پوری طرح محسوس ہوتا ہے۔یہ نہ ہوتی تو خدا جانے اس ''خفت خوراکی'' کو دور کرنے کے لیے کیا کیا کرنا پڑتا۔

بر سبیل تذکرۂ دال ہم مینجر صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے فاقہ زدوں کی بھری مجلس میں اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ انہوں نے اصلاحات رائج کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔رات کے وقت چاندنی میں بیٹھ کر لرزہ بر اندام میزوں پر تناول ماحضر فرمانا بہت شاعرانہ خیال ہے۔لیکن اوسط درجے کا انسانی جسم کچھ ایسا بد مذاق واقع ہوا ہے کہ اس سے کچھ تسلی نہیں ہوتی۔خیر اب تو ماشاء اللہ ڈائننگ روم کے لیے ایک عدد لیمپ بھی خریدا گیا ہے۔گو چمنی کی شکستگی اور جی کی گوشہ نشینی کا یہ عالم ہے کہ پروانے ''رخ روشن'' کی طرف زیادہ رجوع کرتے ہیں۔بہر حال اب یہ خطرہ نہیں رہا کہ گوشت کی بوٹیوں اور آلوؤں میں تمیز نہ ہو سکے گی یا شلغم کی تین پلیٹیں ختم کرنے کے بعد کوئی صاحب یوں داد دیں گے کہ ''کیا اچھی گوبھی پکی تھی۔''

سننے میں آیا ہے کہ بعض شکر خورے کواڈرینگل کے باورچی کی بے ہنری سے برافروختہ ہو کر ہر صبح و شام نیو ہوسٹل چلے جایا کرتے ہیں کہ کواڈرینگل کی مطبخی اقتصادیات ان کے ہاتھوں نالاں ہیں۔مینجر صاحب وعدہ کرتے ہیں کہ اگر یہ روٹھے ہوئے حضرات کسی طرح مان جائیں اور گھر کی دال کو مرغی کے برابر سمجھیں تو وہ خود اپنے ہاتھ سے نوالہ بنا بنا کر انہیں کھلایا کریں گے۔اگر انہیں یہ شکایت ہے کہ کھانا اچھا نہیں ہوتا تو ہر روز انکے لیے ''پرہیزی'' پلاؤ پک جایا کرے گا۔

اے خوشا! روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفل ما باز آئی

ہم بھی ان کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ حضرت غصے کو تھوک ڈالئے بس اب

یہ روٹھنا ہو چکا۔ جب سے آپ نے منہ موڑا ہے ہمیں کھانا حرام ہو گیا ہے۔ خدا کے فضل سے باورچی' آپ کا۔ باورچی خانہ' آپ کا۔ مینجر' آپ کا۔ خادم عملہ و خلا' آپ کا غلام۔ آپ کے ہم نوالا' آپ کے ریزہ چیں۔ آپ کے ہم پیالہ' آپ کے کاسہ لیس۔ خدا نہ کرے کہ آپ دوسروں کے دروازے پر بھٹکتے پھریں کل ہی کم بخت داغ یہ کہتا پھرتا تھا۔

سبک ہو جائیں گے گر جائیں گے وہ بزم دشمن میں
کہ جب تک گھر میں بیٹھے ہیں وہ لاکھوں من کے بیٹھے ہیں

☆☆☆

فرہنگ

جلو: باگ، لگام، کوتل گھوڑا، زینت، شان وشوکت۔ میسرہ: بائیں طرف، بائیں بازو کی فوج۔ معتمد: اعتماد کیا گیا، بھروسہ کیا گیا، قابلِ اعتبار، سیکرٹری۔ سوتن: سوت، ایک خاوند کی دو یا زیادہ بیویاں آپس میں ایک دوسرے کی سوت کہلاتی ہیں۔ رین: رات، شب۔ بپتسمے: بپتسما، (Baptisma) قائم، عیسائی بچے کے پیدا ہونے پر اس کے سر پر پانی کے چھینٹے مارتے ہیں۔ مطہر: پاک، صاف، مبرا، معصوم۔ کشائش: زاخی، کشادگی، وسعت۔ صدف آسائی: آسانی سے سمندری موتی حاصل ہونا۔ تقاطر: بوندا باندی، پے در پے قطرے گرنا۔ صعوبات: صعوبت کی جمع، سختی، دقت، مشکل، تکلیف، مصیبت۔ اقتصادیات: معاشیات، وہ علم جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم سے بحث کی جاتی ہے۔

بچے

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً بلی کے بچے' فاختہ کے بچے وغیرہ مگر میری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے جن کی بظاہر تو کئی قسمیں ہیں کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننھا بچہ ہے' کوئی پھول سا بچہ ہے اور کوئی چاند سا بچہ ہے لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخودار پنگوڑے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگے بچے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہو کر ایک الارم کلاک کی شکل اختیار کر لی۔

یہ جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں یہ میں نے اور حکماء کے تجربات کی بناء پر لکھا ہے ورنہ حاشا وکلاً میں اس بات کا قائل نہیں۔

کہتے ہیں بچہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے لیکن مجھے آج تک سوائے اس کی قوت ناطقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ روتا ہوا بچہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا اسے چپ کرانا' میں نے جناب اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں شعر پڑھے ہیں' ناچ ناچے ہیں' تالیاں بجائی ہیں' گھٹنوں کے بل چل کر گھوڑے کی نقلیں اتاری ہیں' بھیڑ بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں' سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں بائیسکل چلانے کے نمونے پیش کیے ہیں لیکن کیا مجال جو اس بچے کی یکسوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو جس سُر پر اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اترا ہو اور خدا جانے ایسا بچہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے تو کس وقت؟

بچے کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جب اس کے لیے کسی نہ کسی قسم کا شور ضروری نہ ہو۔ اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پر عائد ہوتا ہے۔ ان کو سلانا ہو تو لوری دیجیے، ہنسانا ہو تو مہمل سے فقرے بے معنی سے بے معنی منہ بنا کر بلند سے بلند آواز میں ان کے سامنے دہرائیے اور کچھ نہ ہو تو شغل بے کاری کے طور پر ان کے ہاتھ میں ایک جھنجھنا دے دیجیے۔ یہ جھنجھنا بھی کم بخت کسی بے کار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں۔ یعنی ذرا سا آپ ہلا دیجیے لڑھکا چلا جاتا ہے اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک ایسی بے سُری، کرخت آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے اور جو آپ نے ''ماںتا یا باپتا'' کے جوش میں آ کر برخوردار کو ایک عدد وہ ربڑ کی گڑیا منگوا دی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ۔ اس سے بڑھ کر میری صحت کے لیے مضر چیز دنیا میں اور کوئی نہیں۔ سوائے شاید اس ربڑ کے تھیلے کے جس کے منہ پر ایک سیٹی دار نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھری جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو والدین کہلاتے ہیں۔ بدقسمت ہیں تو وہ بے چارے جو قدرت کی طرف سے اس ڈیوٹی پر مقرر ہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقعوں پر ان کے ذاتی جذبات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ یہ ضرور کہیں کہ کیا پیارا بچہ ہے۔

میرے ساتھ کے گھر ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں ان کے بچے بھی بے چارے بہت ہی بے زبان ہیں جب ان میں سے ایک روتا ہے تو باقی کے سب چپکے بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ جب وہ روتے روتے تھک جاتا ہے تو ان کا دوسرا برخوردار شروع ہو جاتا ہے وہ ہار جاتا ہے تو تیسرے کی باری آتی ہے۔ رات کی ڈیوٹی والے بچے الگ ہیں ان کا سُر ذرا باریک ہے آپ انگلیاں چٹخوا کر، سر کی کھال میں تیل جھسوا کر، کانوں میں روئی دے کر، لحاف میں لپیٹ کر سوئیے ایک لمحے کے اندر آپ کو جگا کے اٹھا کے بٹھا نہ دیں تو میرا ذمہ۔

انھی مرزا صاحب کے گھر پہ جب میں جاتا ہوں تو ایک ایک بچے کو بلا کر پیار کرتا ہوں اب آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں۔ کئی دفعہ دل میں آیا مرزا صاحب سے کہوں

حضرت! آپ کی ان نغمہ سرائیوں نے میری زندگی حرام کر دی ہے نہ دن کو کام کر سکتا ہوں نہ رات کو سو سکتا ہوں لیکن یہ میں کہنے ہی کو ہوتا ہوں کہ ان کا ایک بچہ کمرے میں آ جاتا ہے اور مرزا صاحب ایک دلدارانہ تبسم سے کہتے ہیں۔ ''اختر بیٹا! ان کو سلام کرو' سلام کرو بیٹا! اس کا نام اختر ہے صاحب' بڑا اچھا بیٹا ہے۔ کبھی ضد نہیں کرتا' کبھی نہیں روتا' کبھی ماں کو دق نہیں کرتا۔'' میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ وہی نالائق ہے جو رات کے دو بجے گلا پھاڑ پھاڑ کے روتا ہے۔ مرزا صاحب قبلہ تو شاید اپنے خراٹوں کے زور و شور میں کچھ نہیں سنتے۔ بدبختی ہماری ہوتی ہے لیکن کہتا یہی ہوں کہ ''یہاں آؤ بیٹا!'' اور گھٹنے پر بٹھا کر اس کا منہ بھی چومتا ہوں۔

خدا جانے آج کل کے بچے کس قسم کے بچے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم بقرعید کو تھوڑا سا رو لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار کوئی مہمان آ نکلا تو نمونے کے طور پر تھوڑی سی ضد کر لی۔ کیونکہ ایسے موقع پر ضد کارآمد ہوا کرتی تھی لیکن یہ کہ چوبیس گھنٹے متواتر روتے رہیں' ایسی مشق ہم نے کبھی بہم نہ پہنچائی تھی۔

فرہنگ

حاشاوکلا: خدا نہ کرے' خدا کی پناہ، ہرگز نہیں۔ ناطقہ: بولنے کی قوت، طاقت گویائی۔ مُہمل: چھوڑا ہوا، ترک کیا ہوا، بے کار۔ کرخت: سخت، کڑا۔ بقرعید: عیدالاضحیٰ، عید قربان۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

Gohar Publications